زندہ تحریریں

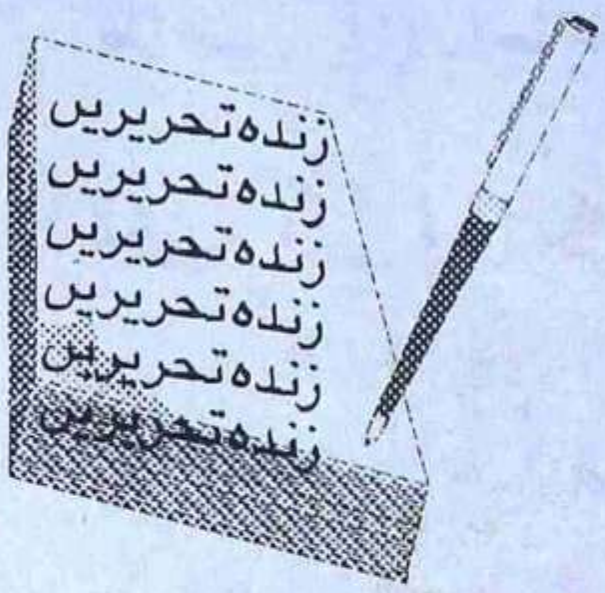

علمی، تاریخی، سیاسی، معاشرتی
موضوعات پر مقالات کا مجموعہ

اثر نگارش

جسٹس علامہ حسن رضا غدیری

ادارہ منہاج الصالحین، جناح ٹاؤن، ٹھوکر نیاز بیگ لاہور فون 5425372

زندہ تحریریں

علمی، تاریخی، سیاسی، معاشرتی
موضوعات پر مقالات کا مجموعہ

اثر نگارش

جسٹس علامہ حسن رضا غدیری

ادارہ منہاج الصالحین، جناح ٹاؤن، ٹھوکر نیاز بیگ لاہور فون 5425372

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ

نام کتاب ..... زندہ تحریریں

نگارش ..... علامہ حسن رضا غدیری

اہتمام ..... الغدیر اکیڈمی پاکستان

پیشکش ..... فردوست اکیڈمی۔ لندن

ایڈیشن ..... مئی ۲۰۰۰ء

کمپوزنگ ..... ادارہ منہاج الصالحین لاہور

ہدیہ ..... ۱۰۰ روپے

ناشر

ادارہ منہاج الصالحین، جناح ٹاؤن، ٹھوکر نیاز بیگ لاہور فون 5425372

انتساب

قلم کے نام!
جس نے ہمیشہ
اہل قلم کو جرات تحریر عطا کی
اور اہل قلم کے نام!
جنہوں نے تحریر کی جرات کے ساتھ
جرات کو صورت تحریر بخشی
اور
ان زندہ نگاہوں کے نام
جو زندگی بھر
زندہ تحریروں کی تلاش میں رہتی ہیں

حسن رضا ندیری

اس کتاب میں شامل تحریریں

درج ذیل رسائل و جرائد میں شامل ہوئیں

- ☆ روزنامہ جنگ لاہور
- ☆ روزنامہ جنگ لندن
- ☆ روزنامہ جنگ کراچی
- ☆ روزنامہ نوائے وقت لاہور
- ☆ روزنامہ پاکستان لاہور
- ☆ روزنامہ نیشن لندن
- ☆ روزنامہ السلام علیکم پاکستان (لندن)
- ☆ ماہنامہ الغدیر لاہور
- ☆ ماہنامہ الحوزہ لاہور
- ☆ سہ ماہی آگاہی لندن
- ☆ سہ ماہی سفینہ ناروے
- ☆ سہ ماہی صحیفہ ولایت لاہور
- ☆ پندرہ روزہ صدائے کربلا حیدر آباد
- ☆ اور دیگر ----------

عرض ناشر

ادارہ منہاج الصالحین کو یہ افتخار حاصل ہے کہ اس نے عالم اسلام کے عظیم دانشور علامہ حسن رضا غدیری کی دسویں کتاب چھاپ رہا ہے- اس سے پہلے علامہ کی نو عدد کتب زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں- جس سے قارئین استفادہ کر رہے ہیں- علامہ غدیری مکتب آل اطہار علیہم السلام کی ترویج و تبلیغ کے لیے شبانہ روز مشغول کار ہیں آپ یورپ کے دل میں بیٹھ کر کفرو شرک کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے ہیں آپ ہر نوع خدمت اسلام کرنے میں مصروف بہ عمل ہیں- آپ یہاں پر درس و تدریس میں مصروف ہیں' وہاں پر آپ تحریر و تقریر اور ارشاد و وعظ میں بھی مشغول ہیں' اپنے علم و فضل سے یہودیوں اور عیسائیوں کو اسلام کے ابدی اور سنہری اصولوں سے روشناس کروا رہے ہیں- آپ وادی کفر میں رہ کر علم و ادب کے چراغ روشن کئے ہوئے ہیں-

علامہ کی زیر نظر کتاب "زندہ تحریریں" آپ کے پراگندہ مضامین کا حسین مجموعہ ہے کہ جو مختلف رسائل و اخبارات میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئے' اور قارئین سے داد تحسین حاصل کر چکے ہیں-

چونکہ یہ مضامین علمی' ادبی' سیاسی اور مذہبی عنوانات پر مشتمل ہیں' اور نہایت ہی سلیس اور رواں دواں ہیں- اس لیے ادارہ نے قارئین کرام کے

استفادہ کے لیے انہیں نہایت ہی عرق ریزی کے ساتھ پوری دلچسپی اور دلجمعی کے ساتھ مرتب کرکے زیور طباعت سے آراستہ کیا ہے- تاکہ یہ تحریریں اپنے عنوان کے مطابق قائم آل محمدؑ کے حضور تک زندہ رہیں- اور ہر عہد کے علم دوست لوگ ان سے استفادہ کرتے رہیں- اس لیے کہ تحریر ہمیشہ زندہ رہتی ہے- محرر مولف و مرتب روپوش ہو جاتے ہیں---- لیکن ان کے علمی شہہ پارے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ مردوں لوگوں کو حیات بخشتے رہتے ہیں' ان آثار خالدہ کا اجر و ثواب صاحب کتاب کو پہنچتا رہتا ہے- ہماری دعا ہے کہ پروردگار عالم ان تمام عظیم المرتبت انسانوں کو اجر عظیم عطا فرمائے جنہوں نے مکتب اسلام کی ترویج و تبلیغ میں حصہ ڈالا- اے خدایا! ہماری اس کاوش کو اپنی بارگاہ عالیہ میں قبول فرما-

والسلام

ریاض حسین جعفری فاضل قم

سرپرست ادارہ منہاج الصالحین لاہور

اظہار خیال

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ
الفاظ بولتے ہیں
تحریریں زندہ رہتی ہیں
اور
ان کے ساتھ ساتھ
اصحاب تحریر بھی زندہ رہتے ہیں
زیر نظر مجموعہ مقالات
دنیائے علم و ادب کی نامدار شخصیت
علامہ حسن رضا غدیری
کی ان تحریروں کا گلدستہ ہے
جو ہمیں مختلف قومی و ملی جرائد سے ملی ہیں
فردوست اکیڈمی لندن
یہ معلوماتی سوغات ارباب فکر و نظر اور علم دوست حضرات
کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتی ہے
گر قبول افتد زہے عز و شرف

ڈاکٹر ایس۔ الف زیدی
ڈائریکٹر فردوست اکیڈمی لندن

حرف اول

"تحریر" درحقیقت افکار و نظریات کے نقش لازوال سے عبارت ہے لفظوں میں جو قوت گویائی ہے اس کا اندازہ دلوں پر ان کی اثر آفرینی سے لگایا جاسکتا ہے، قلم کی آواز بہت مضبوط ہوتی ہے اور اس کی بازگشت بھی گوشہ و کنار عالم میں سنائی دیتی ہے، "زندہ تحریریں" میرے قلم کی زبان سے نکلے ہوئے ان الفاظ کا مجموعہ ہے جو گوناگوں موضوعات کے ضمن میں مختلف جرائد و رسائل سے یکجا کئے گئے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ عجلت کی دھوپ میں بیٹھ کر لفظوں کے اس سفر میں نظریات و موقف کی مکمل ترجمانی نہ ہو سکی ہو تاہم کسی حد تک مافی الضمیر کا اظہار ضرور ہوا ہے، یہ تحریریں قدیم و جدید نگارشات کا کشکول ہے سیاسی، اجتماعی و معاشرتی، علمی، تاریخی وغیرہ تمام حوالوں کے نشانات ان میں موجود ہیں، مجھے اپنی تحریروں کے مجموعہ کی تشویق تو میرے ایک نہایت مخلص دوست نے دی تھی مگر ان کے اخلاص کا افلاس اس سلسلے میں ان سے استفادہ کی راہ میں حائل ہوگیا جس کے سبب سے سلسلہ طویل عرصہ تک رکا رہا، بالآخر ایک روحانی مخلص دوست نے اس کی تکمیل کروائی اور اب بکھرے ہوئے نقوش یکجا کر دیئے گئے ہیں اس کے دیگر حصوں کو کسی مناسب وقت میں یکجا کرکے مجموعہ کی صورت دے دی جائے گی، میری تحریروں میں بالعموم مثبت تبصرے ہیں اور

اگر کہیں ثرید نقطہ نظر دکھائی دے تو اس کا سبب موضوع کی حاسیت و اہمیت ہے ورنہ میں اظہار خیال میں کسی بھی منفی رجحان کا قائل نہیں ہوں' تمام اہل نظر احباب ان تحریروں پر اپنے نقطہ نظر کا اظہار کرسکتے ہیں تاکہ تصویر کے سب پہلو واضح ہو سکیں اور معنی و مفہوم کی صورتگری کے عمل میں خدوخال کی ترتیب کا نقص دور کرنے میں آسانی ہو'

"زندہ تحریریں" زندہ سوچ رکھنے والے زندہ دل افراد کی نذر ہے۔

حسن رضا غدیری

مارچ ۲۰۰۰ء لندن

ترتیب

سیاسی	۱	عالمی اسلامی مشترکہ پلیٹ فارم کی ضرورت	15
سیرت	۲	امام حسین، شہیدِ اسلام، شہیدِ انسانیت	20
اخلاقی	۳	تن درستی اور من درستی	25
سیاسی	۴	اور اب ایٹمی دھماکے	30
سیرت	۵	قرآن کریم میں نعتِ رسولؐ	35
دینی	۶	اسلام، اخوت و برادری کا دین	47
اخلاقی	۷	نسخہ ہدایت و سعادت	54
سیرت	۸	شہادت: ابدی حیات	60
علمی	۹	تقلید، ضرورت، افادیت، شرائط	67
معاشرتی	۱۰	غیر مسلم معاشرہ اور ہماری ذمہ داریاں	79
تاریخی	۱۱	شہادت امام حسین، تاریخ کا المناک واقعہ	72
سیرت	۱۲	سیرت نبویؐ، کردار سازی کا بلند معیار	85

معارف	۱۳	قرآن، جامع دستور حیات	94
تاریخی	۱۴	انہدام جنت البقیع، حادثہ یا سازش	113
سیاسی	۱۵	امریکہ اور ایران، مفاہمت کی نئی کوشش	118
سیاسی	۱۶	کوسوو کے مسلمانوں پر سربوں کے مظالم کی انتہا	123
سیاسی	۱۷	آزاد و خود مختار مملکت کشمیر	130
سیاسی	۱۸	ایران اور سعودی عرب کے سیاسی روابط پر ایک نظر	134
سیاسی	۱۹	۱۴، ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء	140
سیرت	۲۰	مرکز اہلِ بیتؑ	145
معاشرتی	۲۱	مسلمان کب بیدار ہوں گے	149
سیاسی	۲۳	حضورِ عابد (ایک سجدہ گزار کا تذکرہ)	154
سیاسی	۲۴	صادقؑ (سچا رہنما)	156
سیاسی	۲۵	ذکر اس کا جس ذکر عبادت ہے	159
معاشرتی	۲۶	بیسویں صدی میں کیا کھویا، کیا پایا؟	170
تاریخی	۲۷	شمہ شعبان، تجدید عہد کا دن	173
سیاست	۲۸	افغانستان میں اسلامی نظامِ حکومت؟	176
احکام	۲۹	روزہ! قربِ خداوندی کا بہترین ذریعہ	181
احکام	۳۰	حج! عالمی اجتماعی عبادت	163
تاریخی و معاشرتی	۳۱	اکیسویں صدی عیسوی: خوش آمدید	166
سیرت	۳۲	میلادِ علیؑ کے حوالے سے	186
معاشرتی	۳۳	انقلاب ذریعہ ہے مقصد نہیں	189
حقائق	۳۴	بعثتِ نبویؐ کے مقصد سے بغاوت	193

معاشرتی	۳۵	دنیا کھیل کود کا گھوارا	197
سیرت	۳۶	تذکرہ حضرت فاطمہ زہرا	201
سیرت	۳۷	حضرت علی : سب سے پہلے شہیدِ محراب	210
سیرت	۳۸	حضرت علی : مولودِ کعبہ، عادل حکمران	216
علمی	۳۹	اسلامی معاشرے کا شورائی نظام	216
معاشرتی	۴۰	دنیا میں کب امن قائم ہوگا؟	230

عالمی اسلامی مشترکہ پلیٹ فارم کی ضرورت

عالمی حالات کے تناظر میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ اسلام دشمن عناصر ملت اسلامیہ کو محو و نابود کرنے میں اپنے تمام وسائل اور قوتیں استعمال کر رہے ہیں' اعتقادی' اخلاقی' اقتصادی' معاشرتی اور سیاسی لحاظ سے ان کی بھرپور کوشش ہے کہ مسلمان کمزور و بے بس ہو جائیں اور ہمیشہ ہمارے غلام و دست نگر رہیں چنانچہ اکثر مسلمان ممالک کے حکمران اندرونی و بیرونی طور پر بڑی طاقتوں کے سہارے اپنی سیاسی قوت مضبوط کرنے کے لیے کفار و مشرکین سے دوستی کے صمیمانہ معاہدے کر رہے ہیں اور انہیں ان کے مفادات کے تحفظ کا یقین دلا رہے ہیں' کون سا ایسا ملک ہے جہاں مشرق و مغرب کی --- نام نہاد --- بڑی طاقتوں نے اپنے ایجنڈوں کو بھیج کر وہاں کے قدرتی ذخائر اور دیگر اقتصادی وسائل کے ساتھ ساتھ سیاسی قوتوں پر قبضہ نہ جمایا ہوا ہو' اسلام کے نام پر قائم ہونے والی حکومتیں بھی شعوری و لاشعوری دونوں طرح سے اسلام تعلیمات کا خون کر رہی ہیں' اسلامی

جمہوریت کا بنیادی اصول کہیں بھی حکمفرما نہیں۔ عراق میں جو صورت حال درپیش ہے اس میں مظلوم عوام کو ان کے بنیادی انسانی حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے' افغانستان میں حکمران جماعتوں کی کارستانیاں کسی سے پوشیدہ نہیں' عرب ممالک میں غیر ملکی تسلط کے منحوس آثار اب کسی بحث و تبصرہ کے محتاج نہیں رہے' پاکستان میں فرقہ وارایت کی ایک آگ لگی ہوئی ہے جس کے نتیجے میں اب تک سینکڑوں جانیں ضائع ہو چکی ہیں اور بوسنیا کے بعد کوسوو کا مسئلہ بھی عالمی انسانی برادری کے لئے سوال انگیز ہے وہاں ہزاروں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والا ظالمانہ سلوک اپنی انتہاء کو پہنچ چکا ہے' یہ اور اس کے علاوہ کتنے ایسے مسائل ہیں جن کا تذکرہ ایک واضح و معلوم حقیقت کے تکرار سے عبارت ہے' کشمیر میں ظلم و جور کی انتہاء ہو چکی ہے اور بے شمار بے گناہ قتل کئے جا رہے ہیں ادھر سعودی عرب میں جنت البقیع اور جنت المعلی کے مزارات مقدسہ کے انہدام کا زخم مندمل نہیں ہوا تھا کہ حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہؑ کی قبر کو زمین سے یکساں کر دیا گیا ہے جس پر پاکستان سمیت دنیا کے متعدد ممالک میں مسلمانوں نے صدائے احتجاج بلند کی ہے' آخر یہ سب کچھ کس لئے ہو رہا ہے؟ اور کسے خوش کرنے اور کس کے ایماء پر ہو رہا ہے؟ ایک طرف تو اسلام دشمن قوتیں اسلام و مسلمانوں کے خلاف اپنی طاقت آزمائی میں مصروف ہیں اور دوسری طرف خود مسلمان ایک دوسرے کے عقائد کی کھلم کھلا بیحرمتی کر کے وحدت و یک جہتی کی فضا کو تاراج کر رہے ہیں۔ بیت المقدس پر یہودی قبضہ تو اب ماضی کا قصہ بنتا جا رہا ہے۔ اسرائیل کے ساتھ روابط برقرار کرنے کی راہیں ہموار کی جا رہی ہیں۔ مگر مسلمان حکومتیں خاموش تماشائی بنی ہوئی ہیں اور "سپر" طاقتوں کے خوف سے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف

عملی اقدام کرنے سے گریزاں ہیں اسلامی کانفرنس کے رکن ممالک بھی زبانی جمع خرچ کے علاوہ کچھ نہیں کر رہے جس پر جس قدر بھی اظہار افسوس کیا جائے کم ہے۔ امریکہ کی ریاست ھائے متحدہ' روس کے اتحادیوں کی مشترکہ صلاحیتیں اور اب یورپی اتو. م کا ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہونا بھی مسلمانوں کو مشترکہ عالمی اتحاد قائم کرنے کی ترغیب نہیں دلا سکا جبکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ تمام مسلمان ممالک اپنی مشترکہ اقتصادی منڈیاں قائم کرتے اور دنیا بھر میں ایک مضبوط قوم کی طرح اپنا سیاسی تشخص پیدا کرتے تاکہ ان کی ثروت اور سیاہی قوت کے سامنے کوئی اسلام دشمن اپنا مذموم مقصد پورا نہ کر سکے' تیل' گیس اور قدرتی وسائل و ذخائر کا عظیم خزانہ مسلمانوں کے پاس ہے مگر اس سے اسلام دشمن قوتیں فائدہ اٹھا رہی ہیں' مسلمانوں کی اخلاقی زبوں حالی ان کے زوال کا باعث بن سکتی ہے' اب جو صورت حال انسانی حقوق کی عالمی تنظیموں کی رپورٹوں سے سامنے آئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا بھر میں جس قدر حقوق کی پامال کا شکار مسلمان اقوام ہو رہی ہیں کسی دوسری قوم کو اس کا سامنا نہیں' ظاہر ہے کہ اگر مظالم کا یہ بھیانک سلسلہ جاری رہا اور بین الاقوامی سطح پر قتل و غارت و دہشت گردی کے واقعات رونما ہوتے رہے تو مسلمانوں کے احوال و نفوس کی حرمت پامال ہو کر رہ جائے گی اور یقیناً مسلم ممالک کی حکومتیں کف افسوس ملتی رہ جائیں گی لیکن اگر اس طوفان کا راستہ روکنے کے لئے بروقت اقدام کر کے اسلام دشمن قوتوں کے عزائم خاک میں ملا دیئے جائیں تو مستقبل میں مسلمانوں کی بقا کی امید بر آسکتی ہے۔ مگر یہ کب اور کس طرح ہو اور پوری دنیا کے مسلمان اپنی قوتیں یکجا کر کے ایک مضبوط و مستحکم قوم میں کیونکر ڈھل سکتے ہیں؟ اس کا واحد حل یہ ہے کہ اسلام کی مسلمہ تعلیمات پر مکمل طور سے عمل

کیا جائے' خدا کے مقرر کردہ معصوم رہبروں کے بتائے ہوئے اصولوں کو اپنایا جائے۔ غلط و خود ساختہ اور غاصب خلافتوں و سلطنتوں کی باطل نواز روایات کو پس پشت ڈال کر خدا کی آخری کتاب قرآن مجید کو آئین حیات قرار دے کر حضرت پیغمبر اسلام ﷺ اور آئمہ معصومین ؑ کی مکمل پیروی کی جائے اور زندگی کے ہر شعبہ میں خدا کی اطاعت کو بنیاد قرار دیا جائے تو مسلمانوں کے زوال کا راستہ آسانی سے روکا جا سکتا ہے اور تاریخ میں ملت اسلامیہ کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ اس سے بہتر کوئی دوسرا حل یا طریقہ نہیں جس سے دشمنان اسلام کا ہر میدان میں مقابلہ کرکے ان کے شیطانی عزائم کو ناکام بنایا جا سکے۔ اس سلسلے میں تمام مسلمان ملکوں کے مخلص و پاکدل دانشور اور اہل علم حضرات ارباب اقتدا کے ساتھ مشاورت کے اصول پر مبنی ایک جامع لائحہ عمل مرتب کریں جس سے ملت اسلامیہ کا عالمی اتحاد خدا کی بندگی و اطاعت اور برحق ہادیان امت کی پیروی کے سایہ میں وجود میں آجائے اور امت محمدیہ ﷺ پر چھائی ہوئی شب سیاہ ڈھل جائے اور امن و سلامتی کی نورانی صبح طلوع ہو۔

اسلام جو کہ علم و عمل کا دین ہے اس کے پیروکاروں پر لازم ہے کہ علمی کمالات حاصل کرکے دنیا میں اپنی فکری صلاحیتوں کو ظاہر کریں سائنسی ایجادات میں بنیادی کردار کے حامل مسلمان افراد کی استعدادات اور عظیم صلاحیتوں و توانائیوں کو یکجا کر کے ملت اسلامیہ کے مفادات کے تحفظ کے لئے استعمال کیا جائے اور آنے والی نسلوں کی فکری و عملی تربیت کے پروگرام کو یقینی بنایا جائے۔ عصر حاضر جس طرح مادی ترقی کے حوالہ سے نہایت تیزی کے ساتھ اپنا سفر طے کر رہا ہے اس دور میں اہل اسلام پر پہلے ہر دور کی نسبت زیادہ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں کہ اپنی صفوں میں

اتحاد قائم کرکے اپنی توانائیوں کو ضائع ہونے سے بچائیں اور بین الاقوامی مشترکہ اسلامی پلیٹ فارم تشکیل دیں جس کے ذریعے اپنی تمام ضروریات و احتیاجات کو پورا کرنے کا انتظام کریں۔ یہ دور غفلت کا نہیں بیداری کا دور ہے جہالت کا نہیں علم کا دور ہے اور تنزلی کا نہیں ترقی کا دور ہے اس میں مسلمان اپنا وقار بحال کر سکتے ہیں۔

اپریل 1999ء

امام حسینؑ، شہید اسلام، شہید انسانیت

حضرت امام حسینؑ نے جس مخصوص انداز میں اسلام و انسانیت کی حفاظت کی اور اس راہ میں اپنی نہایت مقدس جان کا نذرانہ دیا اس پر آپ کو شہید اسلام اور شہید انسانیت کہا جانا چاہیے کیونکہ آپؑ نے دین خداوندی کی بقا اور روح انسانیت کو زندہ رکھنے کے لئے جو اہم ترین کارنامہ سرانجام دیا اس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں کہیں بھی نظر نہیں آتی۔

حضرت پیغمبر اسلام محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مقدس آغوش میں پہلے والا حسینؑ اپنے جدامجد کے لائے ہوئے آئین حیات کو پامال ہوتا دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا سب کچھ قربان کرکے کربلا کی سرزمین پر اسلام کی بقا کی ضمانت فراہم کر دی اور انسانیت کو محوونابود ہونے سے بچالیا' آج اسلام کی جو شکل و صورت ہمارے سامنے ہے وہ صرف امام حسینؑ کی عظیم قربانی کے نتیجے میں ہمیں حاصل ہوئی ہے۔ اگر امام حسینؑ کربلا میں اپنی جان کا نذرانہ پیش نہ کرتے تو آج رسول اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بتایا ہوا راستہ ہمیں دکھائی نہ دیتا اور نہ ہی انسانیت کی شکل نظر آتی۔

قرآنی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے کا رتبہ کتنا بلند ہے اور حق کی حفاظت کر لئے ایثار و قربانی کا خدا کے نزدیک کتنا بڑا اجر ہے۔

حق کی خاطر جان قربان کرنا ابدی حیات پانے کی ضمانت دیتا ہے۔ شہید ہمیشہ زندہ ہوتا ہے اس کی زندگی عام انسانوں کی زندگی سے مختلف ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو مٹا کر خدا کا نام بلند رکھنا چاہتا ہے جس کے نتیجہ میں خدا اس کا نام ہمیشہ باقی رکھتا ہے اور جہاں خدا کا نام آتا ہے وہاں خدا کی راہ میں جان قربان کرنے والے شہید کا نام بھی آتا ہے۔

اسلامی روایات اس حقیقت کی گواہ ہیں کہ خدا کے دین کی خاطر سابقہ انبیاء کی تمام کاوشوں کو نتیجہ بخش بنانے کے لیے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دور کے کفار و مشرکین کی طرف سے ہر طرح کی سختیاں برداشت کیں اور سخت ترین حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ہر قسم کی مشکلات کے باوجود اپنے پاکیزہ مشن کو آگے بڑھاتے رہے۔ مکہ کے کفار و مشرکین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سیاسی و معاشرتی اور اخلاقی و اقتصادی طور پر کمزور کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی اور جب دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے توحیدی مشن سے ہرگز دستبردار ہونے والے نہیں ہیں تو لالچ و طمع دے کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوچ پر اثر انداز ہونے کی موھوم کوشش کی مگر خدا کے برحق نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی سوچوں پر پانی پھیر دیا اور اپنے سچے موقف پر قائم رہے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی طرف سے دنیاوی لالچ کے مقابلے میں صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اگر میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند رکھ دیا جائے تب بھی میں دین توحید سے دستبردار نہ ہوں گا خواہ اس مقصد کے لئے مجھے کتنی صعوبتیں کیوں نہ جھیلنی پڑیں' تاریخ گواہی دیتی ہے کہ کافروں اور مشرکوں نے اپنے قبائلی و قومی تعصب کے حوالہ سے اپنی تمام تر طاقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا راستہ روکنے میں صرف کر

دی اور ہر لحاظ سے آپ ﷺ کو بے بس کر دینے کے تمام طریقے اور حربے اپنائے مگر آپ ﷺ کے پائے استقلال میں لغزش نہ آنے پائی اور اپنے برحق مشن کی تبلیغ میں مصروف رہے' مال و دولت اور طاقت انہیں خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچانے سے باز نہ رکھ سکے' اسی اسوہ کی روشنی میں حضرت سید الشہداء امام حسینؑ نے خدا کے دین کو بچانے کے لئے ہر طرح کے دنیاوی لالچ کو پاؤں کی ٹھوکر ماری اور نام نہاد مسلمان خلیفہ یزید کی ناجائز حکومت کے مقابلے میں سنت نبوی ﷺ کی مثال قائم کرتے ہوئے حق کے موقف پر ڈٹ گئے۔ اس کے لئے آپؑ کو مدینہ منورہ کو خیرباد کہنا پڑا مکہ مکرمہ سے حج کا احرام عمرہ میں تبدیل کر کے کربلا کا رخ کرنا پڑا اور بالاخر اپنی اور اپنے باوفا ساتھیوں کی شہادت کے ذریعے اسلام کی ڈوبتی کشتی کو نجات دینے میں کامیاب ہو گئے۔

حضرت سید الشہداء امام حسینؑ کی عظیم قربانی کے صدقہ میں آج دنیا بھر میں پرچم توحید سربلند ہے اور یہ پرچم سربلند ہی رہے گا۔ امام حسینؑ نے جس مقدس مقصد کے لئے قربانی دی اس کی حفاظت آج ہر کلمہ گو پر فرض ہے۔ امام حسینؑ اسلام اور انسانیت کے محسن اعظم ہیں آپؑ کا مقدس مشن رہتی دنیا تک باقی رہے گا۔

حضرت امام حسینؑ نے اسلام کو تحفظ دے کر اور انسانیت کی پاکیزہ قدروں کی پاسداری کر کے ایک ایسی مثال قائم کر دی ہے جس سے رہتی دنیا تک آنے والی نسلیں درسِ عمل حاصل کرتی رہیں گی آپؑ نے یزید کی تمام مادی پیش کشوں کو ٹھکرا کر دنیا پر ثابت کر دیا کہ خدا کا دین اس کے ہی منتخب نمائندوں اور معصوم رہنماؤں کے ذریعے بچ سکتا ہے۔ اسلام کی مقدس تعلیمات کا مذاق

اڑانے والا یزید اپنی ظاھری فتح پر نازاں تھا اسے اپنی طاقت پر غرور تھا وہ یہ سمجھتا تھا کہ طاقت حق ہے مگر حضرت امام حسینؑ نے اپنی استقامت اور ایثار سے ثابت کر دیا کہ طاقت کو حق سمجھنے والے غلطی پر ہیں حقیقت یہ ہے کہ طاقت حق نہیں بلکہ حق طاقت ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ طاقت کے ذریعے حق کو دبایا یا مٹایا نہیں جا سکتا۔ امام حسینؑ نے یزید کے مقابلے میں مادی طاقت کے نہایت معمولی حد تک حامل ہونے کے باوجود حق کی طاقت کا مظاھرہ صبر و شہادت سے کیا۔ امام حسینؑ بھوک، پیاس، گرمی کی شدت اور دشمنوں کی کثرت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اعلائے کلمہ حق کی خاطر میدان میں کود پڑے اور یہ اعلان کر دیا کہ جب تک میرے جسم میں ایک قطرہ خون باقی ہے میں خدا کے دین، محمد ﷺ کی شریعت اور انسانیت کی اعلی اقدار و تحفظ کا فریضہ ادا کرتا رہوں گا۔ امام حسینؑ نے واضح الفاظ میں مد مقابل دشمنان اسلام کو للکار کر فرمایا کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ مجھے قتل کر کے اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ یہ تمہاری غلط فہمی ہے میں نواسہ رسول ﷺ ہوں جگر گوشہ علیؑ و بتولؑ ہوں میں خدا کے دین اور انسانیت پر آنچ نہیں آنے دوں گا اور میں نے عہد کر رکھا ہے کہ توحید اور فطری حریت کے پاکیزہ اصولوں کا پرچار کرتا رہوں گا تم مجھے طاقت سے دبا نہیں سکتے۔

امام حسین ع نے اپنے عہد کو پورا کیا اور اپنے مقدس خون سے شجر اسلام و باغ انسانیت کی اس طرح آبیاری کی کہ آپؑ کے نام سے اسلام کا نام روشن اور آپؑ کے ذکر سے انسانیت کا پرچم سربلند ہو گیا۔ آج مسلمان اور دیگر اقوام انسانیت کی جن پاکیزہ قدروں کی حامل ہیں وہ صدقہ ہے نواسہ رسول ﷺ

کی عظیم قربانی کا۔ آپ ؑ نے آپنے ساتھیوں اور اہل بیت ؑ کے افراد کے سات صحرائے کربلا میں حق کو طاقت ثابت کیا یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد کسی بھی حاکم نے بیعت کا مطالبہ کسی بھی معصوم امام ؑ سے نہ کیا اور اس کے ساتھ ساتھ امام حسین ؑ کی یاد کا چراغ بنی نوع انسان کے کاشانہ دل و دماغ میں روشن ہے اور آپ ؑ کے پاکیزہ ذکری شمع اپنی روشنی سے محفل ہستی کو منور کئے ہوئے ہے۔

مارچ 1996ء

تن درستی اور من درستی

عام طور پر انسان تن درستی پر اس قدر توجہ دیتا ہے کہ اپنی تمام تر توانائیاں اس کے لئے وقف کر دیتا ہے اور ہمیشہ اس گمان کو اپنے اعمال کی بنیاد قرار دیتا ہے کہ اس کا جسم صحت و سلامتی کا حامل ہو تو وہ سعادت مند ہے ورنہ نہیں۔ جبکہ حقیقت حال اس سے مطابقت نہیں رکھتی بلکہ سعادت و خوشبختی کا راز تن درستی میں نہیں من درستی میں مضمر ہے۔ من درستی ہی تن درستی کی ضمانت دیتی ہے۔ بیمار من ہمیشہ صحیح و سالم تن کو بھی بیمار کر دیتا ہے اسی لئے اسلام نے من درستی پر توجہ دی اور اس کی بھرپور تاکید کی تاکہ اس کے ذریعے تن درستی کا ہدف بھی پورا ہو جائے۔

حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے کہ جسمانی صحت کے لئے صفائی و پاکیزگی بنیادی حیثیت کے حامل اسباب ہیں لہٰذا کھانے پینے اور رہنے سہنے میں جسمانی و روحانی پاکیزگی کے اصولوں کو اپنایا جائے تاکہ من درستی کے نتیجے میں تن درستی کا مقصد بھی حاصل ہو جائے۔

دنیا میں عام طور پر جسمانی بیماریوں کے علاج کے لئے علم طب و حکمت کے مادی نسخوں پر اکتفاء کی جاتی ہے اور ہر مرض کو جسمانی نقص و خرابی کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے چنانچہ اس محدود و مخصوص زاویہ نگاہ سے بیماری دور

کرنے کے لئے دوا اور علاج کی تشخیص کا عمل انجام پذیر ہوتا ہے لیکن عصر حاضر میں علمی ترقی اور دانشوروں کے تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ جسمانی امراض کا علاج بدنی نقص و خرابی کے دور کرنے سے مخصوص و محدود نہیں بلکہ اکثر بیماریوں کے وجود میں آنے کے عوامل نفسیاتی و روحانی ہیں لہٰذا جب تک ان عوامل کا سدباب نہ ہو تو دیگر تمام طریقہ ہائے علاج نہایت عارضی اور بسا اوقات برعکس نتیجہ ظاہر کرتے ہیں جس کی وجہ سے اصل خرابی دور نہیں ہوتی اور "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" کے مصداق مرض میں شدت پیدا ہو جاتی ہے اور دونوں کے منفی اثرات ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر سر درد، دل کی بیماری، جوڑوں کے امراض، آنکھ کی تکلیف اور دیگر اعضاء کی خرابی و ضعف کے عوامل و اسباب عام طور پر جسمانی کے بجائے نفسیاتی ہوتے ہیں جس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ بدن و روح یا جسم و نفس میں باہمی ربط کی کیفیت کس قدر مستحکم ہے۔ قدیم و جدید طب کے ماہرین نے طویل تجربات کے بعد جن بیماریوں کا انکشاف کیا ہے ان میں سے اکثر نفسیاتی عوامل سے پیدا ہونے والے امراض ہیں۔ عین ممکن ہے کہ کسی کو چوٹ لگنے یا پھوڑے پھنسی کی وجہ سے جلد کی کوئی تکلیف ہو اور اس کی وجہ سے وہ درد کی شدت سے دوچار ہو جائے اور جلد کی خرابی دور کرنے کے لئے اسے کریم وغیرہ دی جائے تو بظاہر زخم یا پھوڑے وغیرہ کے اثرات ختم ہو جائیں لیکن درد کا احساس باقی رہتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قوت احساس کو تاہنوز جسمانی درمان سے تسکین حاصل نہیں ہوئی چنانچہ مریض کو بیماری کے بیرونی آثار کو ختم کرنے کے لئے مخصوص علاج نا گذیر ہوتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ درد ختم کرنے والی ادویات درد کے

احساس کو تو ختم کر دیتی ہیں اصل بیماری کی بیخ کنی ہرگز نہیں کرتیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید طب کے ماہرین نے جو دوائیں تیار کی ہیں ان کی بابت خود ہی انہوں نے تصدیق کر دی ہے کہ ان کے جنبی اثرات ایک درمان کے بدلے متعدد دیگر امراض کو جنم دینے کا لامتناہی سلسلہ قائم کر دیتے ہیں جس کے نتیجے میں مریض ایک بیماری سے چھٹکارا پا کر بے شمار بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اس لئے میڈیکل سائنس یعنی علم طب کے ماہرین دواؤں کی تیاری میں منفی اثرات کی مقدار کم کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

موجودہ دور میں طب کے شعبہ میں جس قدر ترقی ہوئی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں لیکن بیماری کا علاج اور اس کے وجود میں آنے کے اسباب کی روک تھام دو الگ موضوع ہیں اور ان دونوں کے مسائل بھی مختلف ہیں علاج بیماری پیدا ہونے کے بعد جبکہ روک تھام اس سے پہلے ہوتی ہے۔ بیماری کے وجود میں آنے کے عوامل کا سد باب یا ان کی تاخیر میں حتی الامکان کمی کر دینے کے عمل میں نفسیاتی اصولوں کا عمل دخل زیادہ ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ غذا اور ماحول کی صحت انسانی جسم کی درستی و درستگی کا ایک بنیادی سبب ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ روح و نفس اور عقل و احساس کی سلامتی کے اسباب انسانی جسم کے لئے ماحول اور غذا کی نسبت کہیں زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ قوت نفس جسمانی بیماریوں اور خرابیوں کے آثار کو پھلنے پھولنے کا موقعہ ہی نہیں دیتی اور یہ قوت درحقیقت روح کی پاکیزگی سے حاصل ہوتی ہے۔ روح کی پاکیزگی خدا سے وابستہ رہنے کا فطری نتیجہ ہے لہٰذا یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ خالق سے لو لگانا (من درستی) اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری

کے ذریعے اس سے وابستہ رہنا (من درستگی) ہی روحانی پاکیزگی کا سبب ہے کہ جو جسمانی صحت (تن درستی) کو یقینی بنا دیتی ہے اور انسان میں مدافعانہ قوت (تن درستگی) کے اضافہ کا باعث بنتی ہے۔

من درستی اور تن درستی کے باہمی تعلق و ربط کے حوالہ سے اسلام کے جلیل القدر پیشواؤں نے جو ارشادات فرمائے ہیں ان سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ جسمانی صحت کا راز روحانی پاکیزگی میں پوشیدہ ہے۔ نفسیاتی مسائل جسمانی امراض کو جنم دیتے ہیں۔ موجودہ دور میں دل کی بیماریوں کا عمومی سبب فکری اضطراب قرار دیا جاتا ہے اس فکری اضطراب کے اسباب و عوامل معاشی ہوں یا معاشرتی یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے لیکن کوئی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ انسان مادی خواہشات کی تکمیل میں جب حد سے تجاوز کرتا ہے تو جسمانی و فکری امراض کا شکار ہو جاتا ہے چنانچہ اطباء اس کی بیماری کی اصل وجہ کو دور کرنے کے بجائے اسے درد کم کرنے یا درد کی شدت کا احساس نہ ہونے کے لئے نیند کی گولیاں دے دیتے ہیں جو اس کے دل کے نظام اور خون کے مطلوبہ گردشی عمل کو متاثر کرتی ہیں اور جوں ہی ان گولیوں کا اثر ختم ہونے لگتا ہے اس کے اضطراب میں پہلے سے کہیں زیادہ شدت پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ اس کے بدن کا پورا نظام درہم برہم ہونے لگتا ہے۔

اسلام میں جسمانی علاج کی بھرپور تاکید کی گئی ہے لیکن اس پر اکتفاء کرنے کی ترغیب نہیں دلائی گئی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بیماریوں کے اصل اسباب کو ختم کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اسلامی علم الطب میں پھلوں' سبزیوں اور قدرتی اشیاء کی خصوصیات ذکر کرکے ان سے علاج کے طریقے بتائے گئے ہیں

چنانچہ طب النبی ﷺ (حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کے بتائے ہوئے درمانی نسخے) طب الائمہ ؑ (آئمہ معصومین ؑ بالخصوص امام جعفر صادق ؑ اور امام علی رضا ؑ کے بتائے ہوئے طبی نسخے) اس کا واضح ثبوت ہیں لیکن اس کے باوجود ان ہستیوں نے اخلاقی قدروں کی پاسداری اور روحانیت کی تقویت کے امور کو جسمانی بیماریوں کے خاتمہ میں مؤثر قرار دیتے ہوئے ان کی بھرپور تاکید کی ہے تاکہ ''من درستی'' کے نتیجے میں ''تن درستی'' کا ہدف حاصل ہو سکے۔

اور اب ایٹمی دھماکے!

تقسیم ہند اور مسلمانوں کی آزادی کی تحریک کے کامیاب ہونے کے بعد برصغیر کا یہ علاقہ مسلسل تنازعات، جنگوں اور ایک دوسرے پر طاقت کے ذریعے برتری حاصل کرنے کے واقعات کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے نام پر مسلمانوں کی آزاد و مستقل ریاست تشکیل پا گئی اس کے پس منظر و اسباب اور آزادی کے سفر کے مراحل کی تاریخ پر بحث کرنے کے بجائے اس وقت ہمارے سامنے جو صورت حال ہے وہ یہ کہ دونوں ممالک یعنی پاکستان اور ہندوستان نے یکے بعد دیگرے ایٹمی دھماکے کر دیئے ہیں۔ پاکستان نے غوری مزائل داغنے کا جو کامیاب تجربہ کیا ہے اس سے علاقہ بھر میں میزائلوں کے ذریعے جوہری صلاحیتوں کے عملی مظاہرے کی بحث چھڑ گئی ہے اس سے قبل بھارت نے پرتھوی میزائل بنا کر درجنوں کی تعداد میں اپنی فوج کے حوالے کر دینے کا اعلان ہی نہیں بلکہ اسے پاکستانی سرحدوں پر نصب کر دیئے جانے کی بابت اعلان کرکے اپنی عسکری قوت کی بالادستی کا اظہار یا دعوی ہی نہیں بلکہ عملی ثبوت فراہم کیا تھا اور پھر پاکستان نے بھی "ہم کسی سے کم نہیں" یا "اینٹ کا جواب پتھر

سے" کی بنیاد پر غوری میزائل کا تجربہ کرکے اپنی ایٹمی قوت کا عملی اظہار کیا تاکہ اس کے روایتی حریف کو اپنی برتری کا احساس "کچھ" کر دینے پر مجبور نہ کر دے اور اگر وہ کچھ کرنا بھی چاہے تو سنبھل کر اور جواب کی توقع کرتے ہوئے کرے' ادھر امریکہ نے بھی پاکستان کو اپنے دفاع کے لئے غوری میزائل کی ضرورت کی تصدیق کرکے اپنے بہی خواہوں کی ایٹمی صلاحیتوں کو وسیع تر کرنے میں سیاسی و غیر سیاسی حمایت و مدد کا واضح اشارہ دے دیا ہے۔ ابھی ان میزائلوں پر عالمی سطح پر تبصرے جاری تھے کہ بھارت نے پے در پے پانچ ایٹمی بموں کے دھماکے کرکے جنگی جنونیت کا ثبوت دیتے ہوئے تمام عالمی علاقائی اصولوں و ضوابط کی دھجیاں بکھیر دی ہیں جس سے علاقہ کا امن خطرے میں پڑ گیا ہے اور پاکستان نے ایٹمی دھماکوں کا جواب دینے کے لئے حکمت عملی تیار کرلی ہے جس پر مغربی ممالک کی طرف سے پاکستان پر شدید دباؤ پڑا ہے اور پاکستانی عوام نے اپنی حکومت سے بھرپور مطالبہ کیا ہے کہ ایٹمی دھماکے کرکے بھارت کو منہ توڑ جواب دیا جائے۔ پاکستانی سیاستدانوں اور ارباب اقتدار نے مشترکہ طور پر عوام کے مطالبہ کو عملی جامہ پہنانے کی بھرپور تیاریاں شروع کر دی ہیں جبکہ حکومت پہلے ہی ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے اور فوری طور پر دھماکے کرنے کی صلاحیت کا اعلان کر چکی ہے جس سے علاقہ میں ایٹمی جنگ چھڑ جانے کے خطرات درپیش ہیں۔

ایٹمی دھماکوں اور جوہری ہتھیاروں کے اندھا دھند استعمال سے غالب و مغلوب اور فاتح و شکست خوردہ کے خطابات کس کا مقدر ہوں گے اور ان فرضی و غیر حقیقی عنوانات سے کون کیا فائدہ اٹھائے گا اس پر اظہار خیال کرنا ضیاع وقت

کے سوا کوئی فائدہ نہیں رکھتا۔

حقیقت یہ ہے کہ جغرافیائی حوالہ سے یہ بات نہایت افسوس ناک ہے کہ پاکستان اور بھارت روایتی رقیبوں کی طرح ہمیشہ ایک دوسرے پر برتری و غلبہ کا احساس زندہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور دونوں اس بات کے خواہاں رہتے ہیں کہ ہر میدان میں اپنی مزعومہ قوت کا عملی ثبوت فراہم کریں۔ کھیل کے میدان سے لے کر عسکری و ایٹمی طاقت ہونے تک تمام امور میں اپنی مافوق الرقیب قوت کا اظہار دونوں ملکوں کی آخری انتہائی خواہش ہوتی ہے۔ یہی حال اقتصادی و تعلیمی میدان میں ہے جبکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ باہمی تعاون کے زریعے حسن و جوار اور اچھی ہمسایگی کا ثبوت دیتے ہوئے علاقہ کی مضبوط سیاسی قوتیں بننے کے لئے ایک دوسرے کی صلاحیتوں سے استفادہ کر کے تاریخ میں اپنی مخصوص پہچان کرواتے لیکن صورت حال اس کے برعکس ہے جس کے نتیجہ میں مشترکہ ثقافتی روایات کے باوجود ایک دوسرے سے رقیبانہ انداز میں بات کرتے ہیں۔ ان دونوں ممالک میں سرکاری مذہب کا جو حوالہ ہر حال میں نمایاں طور پر اجاگر رہتا ہے اس سے قطع نظر ہمسایہ ہونے کے حقوق کا لحاظ بھی ضروری ہے کیونکہ اسلام کسی بھی مذہب کے پیروکاروں سے اس وقت تک دشمنی مول لینے کی اجازت نہیں دیتا جب تک کہ وہ (غیر مسلم گروہ) اسلام اور اہل اسلام کے خلاف نبرد آزما ہونے کی ابتداء نہ کریں۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کی تعداد بھی کم نہیں اور وہ اپنے ملک میں آزادی کے ساتھ اپنے وطنی فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ وطن کی بقا و سلامتی کے عمل میں بھرپور کردار ادا کرنے کے خواہاں رہتے ہیں جیسا کہ یہی طرز عمل پاکستان میں بسنے

والے ہندوؤں، سکھوں اور دیگر ادیان و مذاہب کے پیروکاروں کا ہے لیکن جو بات خاص طور پر اہمیت کی حامل ہے وہ یہ کہ آخر جوہری و ایٹمی توانائیوں کا حصول کسی دوسرے کو ختم کرنے یا نیچا دکھانے سے کیوں مربوط کیا جائے؟ ان صلاحیتوں کو ملکی صنعتوں کے فروغ و استحکام کے لئے کام میں کیوں نہ لایا جائے اور ملک سے بے روزگاری ۔۔۔ کہ جس نے دونوں ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔۔۔ کے خاتمہ کے لئے ان وسائل سے استفادہ کیوں نہ کیا جائے؟ یہ توانائیاں جغرافیائی خطوط کی تقسیم بندیوں پر صرف ہونے کی بجائے علاقائی استحکام اور معاشرتی و معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے سے مخصوص ہونی چاہیں تاکہ اپنے وسائل سے صحیح فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے وطن اور قوم کو مضبوط کرنے کا عمل یقینی ہو سکے۔

دونوں ممالک کی بد قسمتی یہ ہے کہ ان میں فقروجہالت کو دور کرنے کے لئے وسیع پیمانے پر اقدامات نہیں اٹھائے جاتے بلکہ بجٹ کا بہت بڑا حصہ دفاعی ضروریات کو پورا کرنے سے مختص ہو جاتا ہے کہ جسے تعلیم و معیشت پر خرچ ہونا چاہیے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جوہری ہتھیاروں کے حوالہ سے ایک دوسرے پر غلبہ و برتری کا جاہلانہ احساس ختم کیا جائے اور آپس میں پرامن و مصالحت آمیز طرز عمل اختیار کرکے اچھے ہمسایہ ہونے کا ثبوت دیا جائے جو کہ اسلام اور ہر دین کی بنیادی تعلیم ہے جس پر عمل پیرا ہو کر تمام داخلی و خارجی معاملات کو خوش اسلوبی سے حل کیا جا سکتا ہے اور اپنے قومی تشخص کے تحفظ کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔

اس مقام پر اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اس میں

جغرافیائی حدود کی کوئی حیثیت نہیں۔ سب انسان خدا کی زمین میں آزادانہ طور پر آنے جانے اور رہنے سہنے کا برابر حق رکھتے ہیں۔ اگر دنیا میں اسلام کا عالمی انسانیت نواز نظام حیات نافذ ہو جائے تو یقیناً یہ فتنہ و فساد سے بھری ہوئی دنیا امن و عدل کی حکمفرمائی کے ساتھ جنت نظیر بن جائے گی۔ اسلام نے تمام افراد بشر اور بنی نوع انسان کو مساوی حقوق عطا کئے ہیں اور اگر کسی کو کسی پر برتری حاصل ہے تو صرف اور صرف تقوی اور نیک اعمال کی بنیاد پر ہے کہ جس کا اعلان حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے پہلے اعلان حکومت الہیہ میں میں فرمایا تھا کہ عرب و عجم گورے و کالے اور امیر و غریب کے درمیان انسان ہونے کے حوالہ سے کوئی فرق نہیں سب خدا کی مخلوق ہیں اور سب خدا کی پیدا کی ہوئی نعمتوں سے برابر استفادہ کرنے کا حق رکھتے ہیں اور فضیلت و برتری صرف اور صرف تقوی کی بنیاد پر ہے۔

کاش اس انسانی اصول زندگی کو اپنائے ہوے برصغیر کے باسی اپنی تخلیقی قدروں کے تحفظ کو یقینی بنانے میں کامیاب ہو سکیں۔

قرآن مجید میں نعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

قرآن مجید خداوند عالم کی آخری کتاب اور مجموعہ دستورات اسلام ہے اس میں اعتقادات' اخلاقیات' احکام' تاریخ اور حقوق و معاملات کے حوالہ سے جامع اصول' معیار اور ہدایات و ضوابط مذکور ہیں' ان کے علاوہ توحید اور خداوند عالم کی صفات جلیلہ' انبیاء و مرسلین کے اوصاف جمیلہ' صالح و مقرب بارگاہ الٰہی بندوں کے پاکیزہ تذکرے معارف و معالم کی زندہ تصویریں ہیں' ان میں مختلف آیات کے ضمن میں اس عظیم القدر اور جلیل المرتبت ہستی کی نعت بھی ہے جس پر قرآن نازل ہوا اور جس کے پاک دل کو اس پاک کتاب کا ظرف قرار دیا گیا یعنی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

☆ نعت یعنی صفت اس شخصیت کی کہ جس نے مظلوم و محروم اور دکھی انسانیت کو جہالت کی تاریکی سے نکال کر علم و دانش کی روشنی عطا کی۔

☆ نعت اس ذات کی جس نے جاہلیت کی چکی میں پسنے والی اقوام کو تہذیب و تمدن اور پاکیزہ اخلاق کی تعلیم دے کر سربلندی عطا کی۔

☆ نعت اس ہستی کی جس نے ظلم و استبداد اور استحصال کے خلاف علم جہاد بلند کرکے ستم زدہ انسانیت کو آزادی کی نوید دی۔

☆ نعت اس نبی کی جس کی تشریف آوری کو سلسلہ نبوت کی خاتمیت کی علامت قرار دے کر خدا نے اس کی شریعت کو قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے سرمایہ ہدایت بنا دیا۔

☆ نعت اس رسول ؐ کی جسے خالق نے اپنے ان پیغامات کا امین بنایا جن میں ابدی حیات کے تابندہ اصول ذکر کئے گئے تھے۔

☆ نعت اس محبوب کی جس کی محبت میں محب نے اتنی بڑی کائنات کو نعمت وجود عطا کی۔

☆ نعت اس عبد کی جس کی عبدیت و بندگی پر اس کے مولا و آقا نے فخر کیا۔

نعت اس کی جو بزم انبیاء میں پہنچا تو ایک لاکھ چوبیس ہزار صاحبان منصب نبوت نے اس کی سرداری و سروری کا اعتراف کر لیا۔

☆ نعت اس کی جو رسولوں کی بستی میں گیا تو تین سو تیرہ ارباب رسالت نے اس کے سر پر تاج سیادت رکھ دیئے جانے کا جشن منایا۔

☆ نعت اس صاحب شریعت کی جس نے سابقہ تمام شریعتوں کو اپنے دامن حقیقت میں سمیٹ لیا۔

☆ نعت اس صاحب کتاب کی جو امیوں میں رہ کر علم و حکمت کا معجزہ لانے میں کامیاب ہوا کہ جس کی لائی ہوئی کتاب نے اپنی فصاحت

وبلاغت کے گیت گانے والوں کو لاجواب کر دیا اور

☆ نعت اس کی جسے اس کے خالق نے اپنی حمد کی لواء دے کر زمین پر ظہور بخشا تو اپنی حمد آشنا زبان سے اس کا نام محمد رکھ دیا تاکہ جب بھی کوئی زبان شرف طہارت پا کر اس کا ورد کرے تو سماعتوں کو اس کے نورانی اشتقاق سے آگاہی کی دولت مل جائے اور پھر ہر زبان پر درود و سلام کی تسبیح ہو۔

ہاں تو اسی کتاب نے نعت کہی جو "لاریب فیہ" کی سند ساتھ لے کر آئی۔ ہم اسی قرآنی نعت کے صرف چند حصوں کی تلاوت کا شرف حاصل کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں تاکہ اپنے قلب و دماغ کو حبیب خدا کے پاکیزہ تذکرے کی مقدس خشبو سے معطر کر سکیں۔

سب سے پہلے حضرت محمد ﷺ کے مولد اور شہر ولادت کے بارے میں قرآنی انداز نعت ملاحظہ ہو۔

لَا اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ (بلد ۱۔ ۲)

"مجھے قسم ہے اس شہر کی کہ تو اس شہر میں رہتا ہے۔"

حبیب ﷺ کے شہر کی قسم کھا کر خدا نے جس انداز عشق کی تعلیم دی ہے اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ یہ خدائی طرز سخن ہی اپنے اندر ادب و محبت کی پاکیزہ قدروں کا حامل ہے ورنہ کسی بندے میں اس انداز فکر کی توقع ممکن نہیں۔ کون ہے جو اپنے محبوب کے قدموں کو بوسہ لینے والی ہی نہیں بلکہ اس کی جوتیوں کو چومنے والی زمین کی قسم کھائے۔ یہ خدا ہے کہ جس نے اپنی مقدس کتاب قرآن مجید میں اس شہر کی قسم کھائی بس میں اس کے محبوب کی ولادت

ہوئی۔ شہر میں تو ہر قسم کی مخلوق رہتی ہے مگر قسم کھانے والے نے جس نسبت کی قید لگا کر اس کی قسم کھائی ہے اس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ نومولود کی ولادت سے اس شہر کو اس عظمت کا شرف حاصل ہوا کہ اس کی قسم کھائی جائے (وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ) اس سورہ کا نام بھی "بلد" (شہر) رکھ دیا۔

آپ ﷺ کی وجودی عظمت کا اظہار ان لفظوں میں کیا:

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○

"ہم نے تجھے ہر جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔"

اس نعتیہ اظہار فضیلت میں وجود محمد ﷺ کو "عالمین" (ہر جہان) ---- یا سب جہانوں ---- کے لئے رحمت قرار دیا گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ اس بابرکت وجود کی بدولت ہر جہان قائم ہے۔ اس میں کسی ایک جہان یا جہان بشریت یا ارضی جہان کی قید نہیں بلکہ ہر عالم ---- ہر جہان ---- شامل ہے خواہ زمینی ہو یا آسمانی، بشری یا دیگر موجودات سے تعلق رکھنے والا۔ ماضی کا جہان ہو یا حال و مستقبل کا، گویا زمانہ وغیرہ سے قطع نظر آپ ﷺ کا وجود ہر جہان کے لئے رحمت ہے۔ یہ عظیم فضیلت یقیناً اسی سے مخصوص ہے جس کے فیض وجود سے نہ صرف یہ کہ دنیا کو وجود ملا بلکہ اسی کے دم سے کائنات کو بقا کی نعمت بھی حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ "عالمین" میں دنیاوی جہان کے ساتھ ساتھ آخرت کا جہان بھی شامل ہے کہ آپ ﷺ اس جہان میں بھی مخلوق خدا کے لئے رحمت ہیں ان کی شفاعت کریں گے اور بارگاہ احدیت میں اپنی وجودی حیثیت کے حوالہ سے مغفرت و بخشش اور عطا و عنایت ربانی سے اہل جہان کو سرفراز فرمائیں گے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاکیزہ اخلاق کا نعتیہ تذکرہ اس طرح ہوا:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْم۔

"اور یقیناً آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عظیم اخلاق کی منزل پر فائز ہیں۔"

اخلاق کو عظمت کی صفت سے متصف کرنا بذات خود ایک امتیازی انداز نعت ہے۔ اخلاق کی عظمت سے مراد اس کا ہر لحاظ سے کمال کا حامل ہونا ہے اور کمال بھی وہ جس کا اظہار خالق کمال بلکہ کمال مطلق کرے۔ وہ ذات جو اپنی ہر جہت میں کمال ہے وجودی و صفاتی اور افعالی تمام جہات میں وحدت رکھتا ہے اور وہ وحدت اس کے کمال سے عبارت ہے۔ وہ اپنے محبوب کی توصیف اس کے باعظمت اخلاق کے تذکرے کا ساتھ کر رہا ہے اور اس کے اخلاق کو کسی مخصوص پہلو میں محدود بھی نہیں کر رہا بلکہ ہر قسم کا اخلاق' تمام اخلاق' سب اخلاق' نعت کا یہ انداز بھی منفرد حیثیت کا حامل ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کو اہل ایمان کے لئے اپنی طرف سے خاص انعام کے طور پر اس طرح ذکر کیا:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْبَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ ○

"خدا نے مومنین پر احسان و انعام کیا کہ ان میں ایک رسول انہیں میں سے مبعوث کیا جو ان کے سامنے خدا کی آیات کی تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ نفس کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے جبکہ وہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔"

اس نعتیہ تذکرہ میں آنحضرت ﷺ کی بعثت کو خدا کی طرف سے اہل ایمان کے لئے خاص انعام قرار دیا گیا جس سے رسول مقبول ﷺ کی عظمت واضح ہو جاتی ہے اور اس انعام کے ذکر میں خدا نے اپنے حبیب ﷺ کی توصیف میں جن خصوصیات کو بیان فرمایا ان میں آپ ﷺ کی تمام وجودی و منصبی صفات کو یکجا کر دیا چنانچہ ارشاد ہوا:

۱۔ وہ رسول ----- پیامبر ----- ہے۔ خدا کا پیغام اس کی مخلوق تک پہنچانے کا امین ہے۔

۲۔ لوگوں کے سامنے خدا کی آیات ک تلاوت کرتا ہے۔ انہیں علوم الہیہ و معارف ربانیہ سے آگاہی دلاتا ہے۔

۳۔ ویز کیھم اور ان نفوس کو ہر طرح کی نجاست و گندگی سے پاک کرتا ہے خواہ وہ گندگی اعتقادی حوالہ سے ہو یعنی کفر' شرک و نفاق' یا اخلاقی ہوالہ سے یعنی گناہوں و معاصی کا ارتکاب' یا معاشرتی و اجتماعی حالہ سے ہو یعنی فتنہ و فساد اور انتشار پھیلانا' یا حقوق و انسانی حوالہ سے ہو یعنی دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا اور انہیں اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑنا' تو ان تمام نجاستوں سے پاک کرنا آپ ﷺ کی اہم خصوصیت و صفت ہے اور یہ تمام صفات سے زیادہ اہمیت و جامعیت رکھتی ہے۔

۴۔ لوگوں کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے یعنی انہیں خدا کے احکامات اور دستورات سے آگاہی دلاتا ہے اور جہالت و جاہلیت کی بیخ کنی کے لیے کتاب الٰہی پر عمل کرنے کا حکمانہ اصول بتاتا ہے۔

اس نعتیہ تذکرہ میں آپ ﷺ کی صفات کا ذکر کرنے کے بعد لوگوں کے ماضی کی حالت کو بیان کرنا بذات خود اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ کا وجود سر چشمہ ہدایت ہے کیونکہ ارشاد ہوا:

"وَاِنْ کَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِی ضَلَالٍ مُّبِیْنٍ ○" (یعنی اگرچہ لوگ اس سے قبل کھلی گمراہی میں تھے) تو گویا اس گمراہی کا خاتمہ آنحضرت ﷺ کے فیض وجود کا نتیجہ ہے۔

ایک اور مقام پر نعت رسول ﷺ کا قرآنی انداز:

انا ارسلنک شاھدًا و مبشرًا و نذیرًا و داعیًا الی اللّٰہ باذنہٖ و سراجًا منیرًا۔

"ہم نے آپ کو گواہ' خوشخبری دینے والا' انذار کرنے والا اور خدا کی دعوت دینے والا اور روشنی پھیلانے والا چراغ بنا کر بھیجا۔"

اس نعتیہ تذکرہ میں جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ خدائی رابطہ کے حوالہ سے اپنی مثال آپ ہیں۔

شاہد یعنی خدا کی طرف سے لوگوں کے اعمال پر نظر رکھنے والا اور ان کا گواہ ظاہر ہے کہ گواہی کا اعتماد ایک عظیم فضیلت ہے، کہ جس سے آپ ﷺ کے صادق و امین ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

مبشر یعنی خدا کی اطاعت کرنے والے خوش نصیبوں کو اس کی عطا و عنایت کی خوشخبری دینے والا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خدا نے آپ کو آخرت کے حالات سے باخبر کرکے بھیجا اور آپ ﷺ نے ان حالات کے حوالہ سے اہل ایمان و اہل اطاعت کو نعمات الٰہی کی بشارتیں دیں۔ نذیر یعنی معصب

کاروں کو خدا کے عذاب کا خوف دلانے والا۔ اس میں بھی ایک اہم نکتہ ملحوظ ہے جسے عام طور پر درخور اعتناء قرار نہیں دیا جاتا اور وہ یہ کہ انذار کا معنی ڈرانا اس لئے کیا جاتا ہے کہ عام فہم الفاظ میں اس سے بہتر لفظ کوئی نہیں ورنہ انذار کا مطلب ڈرانا یا خوف دلانا نہیں کیونکہ اگر ایسا ہو تو خدا کی عدالت پر ہرف آئے گا کہ اس نے لوگوں کو ڈرا دھمکا کر اپنی اطاعت پر مجبور کیا جو کہ ہرگز ذات احدیت کے شایان شان نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کو عدل الٰہی سے خبردار کرنا ہے کہ کہیں وہ شیطان کے بہکاوے میں آکر خدا کی نافرمانی کرنے کی جسارت نہ کریں کیونکہ خدا کی معصیت و نافرمانی کا ارتکاب کرنا ان کے لئے ہلاکت کا باعث بنے گا اور خدا اپنے عدل کے ساتھ خطاکاروں اور حق سے روگردانی کرنے والوں کا مواخذہ کرنے کا اس لئے بھی حق رکھتا ہے کہ اس نے ان کی ہدایت کے لیے انبیاء و مرسلین بھیجنے اور کتابیں نازل کرنے کے ذریعے ایک وسیع سلسلہ ہدایت قائم کیا کہ اس کے بعد لوگوں پر اس کی حجت پوری ہو گئی لہٰذا تمام حقائق کے آشکار ہونے کے بعد جو شخص اس کی خلاف ورزی کرے وہ عدل الٰہی پر اعتراض کرنے کی بجائے اپنے آپ کو مورد الزام ٹھہرائے' وداعیاالی اللہ باذنہ یعنی لوگوں کو خدا کے اذن کے ساتھ خدا کی طرف آنے کی دعوت دیتا ہے اس صفت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ادائے رسالت کی عظمت کو بیان کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر عمل در حقیقت خدائی تائید سے ہے یہاں تک کہ دعوت الی اللہ بھی خدا کے خاص اذن کے ساتھ ہے' وَسِرَاجًا مُنِیْرًا یعنی روشنی پھیلانے والا چراغ' اس وصف میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجودی کمال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود بھی نور کے حامل ہیں اور دوسروں کو بھی نور ہدایت' نور علم و نور کمال عطا کرنے

والے ہیں۔

قرآن میں نعت رسول ﷺ کا جو مخصوص انداز پایا جاتا ہے اس سے آپ ﷺ کے کمال وجود و کمال ذات کی بھرپور ترجمانی ہوتی ہے۔ آپ ﷺ کے اظہار سخن کی بابت یہ الفاظ ذکر ہوئے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى۔

"وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتا وہ صرف وہی کچھ کہتا ہے جس کی اسے وحی کی جاتی ہے۔"

اس نعتیہ بیان میں آنحضرت ﷺ کے کلام و سخن اور نطق و بیان کو خدائی رابطہ کی سند سے نوازا گیا ہے تاکہ آپ ﷺ پر الزام لگانے والوں کا جواب بھی ہو جائے کہ اس کا کلام اس ذات سے مربوط ہے جس نے اسے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ یہ اپنی طرف سے من گھڑت بات نہیں کرتا' اس صفت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی احادیث مبارکہ کو بالواسط کلام الٰہی سے موسوم کرنا درست ہے۔ حدیث کی بحث میں اہل فکر و نظر نے بھرپور مطالب پیش کئے ہیں اس سلسلے میں تفصیلی تذکرہ اس کے مربوط مقام پر ہو گا یہاں اجمالی طور پر اس امر کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ آپ ﷺ کا کلام نفسانی خواہشات کا ترجمان نہیں ہوتا بلکہ اس کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے لہٰذا اس کی حیثیت قرآن مجید کے بعد ہر کلام سے برتر ہے۔

ایک مقام پر آپ ﷺ کو عطا و عنایت ربانی سے نوازے جانے کا نعتیہ اظہار اس طرح ہوا:

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى۔

"اور تیرا پروردگار تجھے وہ کچھ عطا کرے گا کہ تو راضی و خوش ہو جائے۔"

اس توصیف میں عطاء ربانی کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی رضایت و خوشنودی کی بات خدا کی طرف سے آپ ﷺ کے بلند مقام و مرتبہ کی منہ بولتی تصویر ہے۔ یوں تو پوری کائنات عطا و عنایت خداوندی کی مرہون منت ہے کون ہے جو خدا کی عنایت سے بے نیاز ہو ہر چیز اس کی محتاج ہے مگر اس نے اپنی عنایت پر راضی ہو جانے والی شخصیت کا ذکر جس مخصوص انداز میں فرمایا وہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے مخصوص ہے کیونکہ پوری کائنات رضائے خداوندی کے حصول کے لیے اپنی تمام تر کاوشیں بروئے کار لاتی ہے مگر خداوند عالم نے مذکورہ نعتیہ اظہار میں حضرت پیغمبر اسلام محمد مصطفیٰ ﷺ کی رضا و خشنودی کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ اپنی عطا و عنایت کو اس سے مربوط قرار دے کر بیان کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ نعت رسول ﷺ کا یہ منفرد انداز کسی بھی کلام میں ممکن نہیں۔

آپ ﷺ کو آسمانوں کی سیر کرانے کا نعتیہ ذکر اس طرح کیا:

سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ آیَاتِنَا۔

"پاک ہے وہ ذات کہ جس نے اپنے بندے کو رات کے وقت مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ تک کی سیر کرائی کہ جسے ہم نے برکتوں والا ماحول دیا ہے تاکہ ہم اسے اپنی نشانیاں دکھائیں"

اس بیان میں سب سے پہلے خداوند عالم نے اپنی پاکیزگی کو ذکر کرتے

اپنے حبیب ﷺ کو آسمانوں کی سیر کرانے کے عمل کا تذکرہ کیا تاکہ اس عمل کی اہمیت واضح ہو سکے اور اس آسمانی سفر کہ جسے اسلامی روایات میں "معراج" سے موسوم کیا جاتا ہے اس کا مقصد یہ بیان فرمایا کہ اسے اپنی نشانیاں دکھائیں ان نشانیوں سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں حقیقت الامر کا علم تو اسے ہی ہے جس نے دکھائیں اور پھر اس کو کہ جس نے دیکھیں لیکن ہم اس نعتیہ کلام الٰہی سے اتنا ضرور سمجھتے ہیں کہ وہ خاص اور نہایت اہم و اعلیٰ اور بلند مرتبہ کی چیزیں تھیں کہ جن کا دکھانا زمین کی پستی میں مناسب نہ تھا لہٰذا خداوند عالم نے ان کا دیدار کروانے کے لئے آنحضرت ﷺ کو مسجد الاقصیٰ عرش اعلیٰ پر بلایا کہ جس کے اردگرد کا ماحول بابرکت بنا دیا۔ حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کا سفر معراج آپ ﷺ کے کمال انسانیت و منتہائے عبدیت کا کھلا ثبوت ہے۔

ذکر معراج کے ذریعے خداوند قدوس نے جس طرح اپنے محبوب ﷺ کی نعت کی اس سے اہل یقین کے دلوں میں آنحضرت ﷺ سے محبت کا نور چمک اٹھا اور اس تذکرہ کو قرآنی آیت کا حصہ بنا کر اس کی تلاوت کو تقویت ایمان و تنویر روح کا سبب بنا دیا۔

اگرچہ قرآن مجید میں نعت رسول ﷺ کے حوالہ سے کثیر آیات موجود ہیں لیکن اطالہ اسخن سے بچتے ہوئے آخر میں ایک ایسے نعتیہ سورہ کا تذکرہ کرتے ہیں جس کا اختصار اس کے حسن معانی کا عکاس ہے یعنی سورہ کوثر' اس سورہ نے قرآن کے معجزہ ہونے کا ثبوت اپنی فصاحت و بلاغت کے ذریعے دے کر عرب کے نامور ادیبوں و شاعروں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَر ○ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ ○ اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرْ ○

"خدا کے نام سے جو رحمن و رحیم ہے۔ یقیناً ہم نے کوثر آپ کو عطا کیا' پس آپ اپنے پروردگار کے حضور سجدۂ عبادت (نماز) بجالائیں اور قربانی دیں' یقیناً آپ کا دشمن بے نسل رہے گا۔"

اس نعتیہ سورہ مبارکہ میں عطائے کوثر کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ ﷺ کی توصیف کی گئی ہے۔ عطیہ کوثر خدا کی خاص عنایت سے عبارت ہے' کوثر سے "خیر کثیر" مراد ہے یا نسل کثیر کہ جس کا نقطہ محور حضرت فاطمہ زہراءؑ یا حوض کوثر؟ اس تفسیری بحث سے قطع نظر اس نکتہ کی طرف التفات ضروری ہے کہ خدا نے اتنی عظیم المرتبت نعت عطا فرمائی ہے کہ جس کا تذکرہ اس قدر اہتمام کے ساتھ کیا گیا ہے اور اس تذکرہ کو قرآنی اعجاز کی ٹھوس دلیل بھی قرار دیا گیا ہے۔

قرآنی نعت رسول ﷺ کا دائرہ بہت وسیع ہے اس لئے مذکورہ بالا آیات کے ذکر پر اکتفاء کرتے ہوئے اس مقالہ کو ختم کرتے ہیں کہ خداوند عالم ہمارے قلوب و افکار اور اعمال کو سیرت نبوی ﷺ کے نور سے منور فرمائے۔

1996ء

اسلام: اخوت و برادری کا دین

انسان اپنی طبع وجود کے حوالہ سے محبت و دوستی کو پسند اور عداوت و دشمنی کو ناپسند کرتا ہے چنانچہ خداوند عالم نے انسان کی تخلیق کے بنیادی عناصر میں اچھی و بری چیز کی تمیز اور ان کی عملی پاسداری کا جذبہ شامل کر دیا اور اس جذبہ کی موزوں عملداری اور اس کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے جو دین و آئین تشکیل دیا - یعنی اسلام - وہ ان اصولوں اور معیاروں کا مجموعہ ہے جن میں انسان کے انفرادی و اجتماعی امور کی بابت ایسے خطوط موجود ہیں جن پر چل کر انسان اپنی دنیا و آخرت کی سعادت و کامیابی کو یقینی بنا سکتا ہے مگر افسوس کہ انسان نے خدا کے بنائے ہوئے آئین حیات سے روگردانی کرلی اور خود ساختہ نظاموں کی پروی کرکے اپنے تخلیقی مقام و مرتبت کو کھو بیٹھا' اس حوالہ سے آنسانی معاشرہ اختلافات اور فتنہ و فساد کا شکار ہوگیا بالخصوص وہ افراد جنہوں نے اسلام کی حقانیت کو تسلیم نہ کرکے ملت اسلامیہ پر عرصہ حیات تنگ کر دیا عمومی طور پر وہی اجتماعی سانحوں کے ذمہ دار ہیں'

یوں تو ہر دور میں اسلام کی بابت دیانت کا اقرار کرنے والوں اور آستانہ

توحید پر سرنیاز خم کرنے کا اظہار و اعتراف کرنے والوں کو دشواریوں' سختیوں' مشکلات و مصائب سے دوچار ہونا پڑا مگر عصر حاضر میں ملت اسلامیہ جس طرح مسائل کا شکار ہے اس کی نظیر تاریخ بشریت میں نہیں ملتی' ہر طرف مسلمانوں کو کمزور کرنے اور ان کی صفوں میں رخنہ کرکے ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی عالمی سازشیں زوروں پر ہیں' اپنے آپ کو سپر طاقت کہلانے والے ممالک ترقی پذیر قوموں کا استحصال کرکے ان کے تشخص کو نقصان ہی نہیں بلکہ اسے محو کر دینے کے درپے ہیں' گویا سیاسی طور پر اہل اسلام کو بے وقعت کر دینے کا عمل اتنا تیزی سے جاری ہے کہ آئے دن کسی نہ کسی ملک اور مسلمان ریاست میں بدامنی و انتشار اور سیاسی بحران کی خبریں سنائی دیتی ہیں کون ہے جو اس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ ملت اسلامیہ کی مشکلات کن قوتوں کی پیدا کردہ ہیں؟ اور یہ کہ کون ہے جو مسلمانوں کو متحد و مضبوط دیکھنا گوارا نہیں کرتا؟ عصر حاضر میں اسلام اور ملت اسلامیہ کے خلاف کھلم کھلا گمراہ کن پروپیگنڈہ کے پیچھے جن کا ہاتھ ہے پوری دنیا ان کے عزائم سے واقف ہے' اخبارات' جرائد اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے مسلمانوں کے خلاف گوناگوں طرح سے زہریلی افواہیں اور غلط تاثر دیا جاتا ہے تاکہ اسلام کی پھیلتی ہوئی روشنی کو روکا جا سکے اور اہل اسلام کے کردار کو مشکوک کرکے دیگر اقوام کو ان سے دور رکھا جائے' لیکن اس کے باوجود کلمہ گو توحید پرست طبقہ خواب غفلت میں مدہوش ہے اور اپنے اسلامی وقار کے تحفظ کے لیے عملی اقدام اٹھانے سے گریزاں ہے' افسوس اس بات پر ہے کہ مسلمانوں کے قدرتی ذخائر پر غیر مسلم طاقتوں کا پہرہ ہے اور وہی ہماری ترقی و پیش رفت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لیے ہوئے ہیں' صیہونی قوتیں مسلمانوں میں

گھس کر انہیں معاشی طور پر کمزور کرنے میں مصروف ہیں' ایسے حالات میں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ اہل اسلام کے دانشور حضرات اور ارباب سیاست مل بیٹھ کر سیاسی و معاشرتی مسائل کا تفصیلی جائزہ لیں اور ان کے حل کے لیے اپنی صلاحیتوں کو یکجا کر کے اپنے استحکام کو یقینی بنائیں تاکہ مسلمان ممالک معاشی و اقتصادی طور پر مضبوط ہو سکیں کیونکہ جب تک ہمارے معاشیات مستحکم نہیں ہوں گے ہم غیروں کی غلامی سے نجات نہیں پاسکتے' مقام شکر ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے پاس گوناگوں وسائل و ذخائر موجود ہیں جن کے سہارے وہ اپنی معاشی پوزیشن مضبوط کرسکتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اہل اسلام علم و ہنر اور تحقیق کے حوالہ سے کسی بھی قوم و ملت سے کمتر نہیں ہیں' اس وقت صرف مسلمان ممالک ہی نہیں بلکہ امریکہ' یورپ' برطانیہ و دیگر ممالک میں مسلمان ماہرین کثرت کے ساتھ موجود ہیں اور مختلف علوم وفنون سائنس و ریاضیات اور طب وغیرہ میں خاص مہارت رکھتے ہیں لیکن ان کی صلاحیتوں اور استعدادات کا فائدہ اپنوں کے بجائے غیروں کو پہنچ رہا ہے۔ اگر مسلمان ممالک کے حکمران ماہرین کی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کرنے کے لیے ٹھوس منصوبہ بندی کریں اور غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل افراد کی حوصلہ افزائی کریں تو یقیناً مسلمان ممالک سائنسی ترقی کے حوالہ سے اہل مغرب کے دست نگر نہ رہیں گے بلکہ خدا کی عطا کردہ تیل' گیس اور معدنیات کی عظیم و گرانقدر نعمتوں کو اپنی نوجوان نسل کی فلاح و بہبود اور صلاح و بہتری کے لیے کام میں لاسکیں گے اور اپنے قدرتی وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے قوم کے مستقبل کو چار چاند لگادیں گے'

اس بات سے کون انکار کرسکتا ہے کہ موجودہ مادی دور میں سائنس و

ٹیکنالوجی کی غیر معمولی ترقی و پیشرفت نے زندگی کے گوناگوں مسائل کو آسان بنا دیا ہے۔ البتہ بعض پہلوؤں میں' اور اس سے بڑھ کر کمپیوٹر و انٹرنیٹ کے حیرت انگیز کارناموں کی طویل دوڑ میں بھی سائنس دانوں نے کمالات کے جو عظیم مظاہر پیش کئے ہیں ان میں روز افزوں اضافہ مادی ترقی کا واضح ثبوت ہے اور تحقیق و ترقی کے اس سفر میں مسلمان ماہرین کسی سے پیچھے نہیں بلکہ ان کے شانہ بشانہ اپنی فکری قوتوں کو بروئے کار لانے میں منہمک ہیں لیکن اس کے باوجود ہماری اخلاقی و معاشرتی مشکلات میں کمی کی بجائے اضافہ ہوتا جا رہا ہے' اس حوالہ سے اگر غور و فکر سے کام لیا جائے اور تمام جہتوں اور مربوط پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اہل اسلام مادی ترقی کے نشے میں اس قدر سرمست و مدہوش ہو چکے ہیں کہ اب روحانی قدریں قصہ پارینہ بن کر رہ گئی ہیں اور دینی اقدار سے لگاؤ رسم و رواج کی حدود سے باہر نہیں رہا تو ظاہر ہے کہ جب ہم اپنی توانائیاں اپنے باطن کی اصلاح و پاکیزگی کے بجائے مادی تقاضوں کی تکمیل میں صرف کر دیں تو خدا کی طرف سے حاصل ہونے والی توفیق سے محرومی ہمارا مقدر بن جائے گی لیکن اگر ہمارے جذبات و احساسات ہماری روحانیت کی تقویت کے عملی پروگرام سے ہم آہنگ ہوں اور ہم اپنے مادی و فکری وسائل اپنے ملی تشخص و وقار کے تحفظ کے لیے کام میں لائیں تو نہ صرف یہ کہ ہم دوسری قوموں سے پیچھے نہیں رہیں گے بلکہ عین ممکن ہے کہ ہمارا کاروان تحقیق دوسری اقوام سے کہیں آگے نکل جائے اور مسلمان ممالک اپنے مخصوص اسلامی حوالہ و نسبت سے دنیا بھر میں اپنا ممتاز مقام حاصل کرلیں' بنا برایں یہ کہنا بے جا نہیں کہ ملت اسلامیہ کی مشکلات و مسائل کا حل باہمی

اتحاد و یک جہتی اور فروعی اختلافات کو بھلا کر دشمنان اسلام کے مقابلے میں متحد و یکجا ہونے میں پوشیدہ ہے' یہی حکم قرآن مجید اور سنت نبوی ؐ کا ہے کہ اہل اسلام ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور بھائیوں میں اصولی اختلافات ہرگز نہیں ہوتے بلکہ وہ فروعی اختلافات کو ایک دوسرے سے دوری کا سبب یا عداوت و مخاصمت کا باعث نہیں بننے دیتے۔

اسلام اخوت و برادری کا دین ہے' محبت و دوستی کا آئین ہے' اس کی مقدس تعلیمات ہمیں ایک دوسرے کے قریب ہونے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں برابر کے شریک ہونے کی راہ دکھاتی ہیں' اسلام دوستی ہی نہیں بلکہ برادری کی تعلیم دیتا ہے لہٰذا اگر دنیا بھر میں پھیلے ہوئے کروڑوں اہل اسلام متحد ہو جائیں اور اپنے تمام وسائل یکجا طور پر بروئے کار لا کر اپنے داخلی خارجی مشکلات کے مشترکہ حل کے لیے اقدامات کریں تو پوری دنیا میں اسلام کا پیغام امن و دوستی اور عدل و سلامتی پھیلا سکتے ہیں۔

تاریخ ہمیں ان ایام کی یاد دلاتی ہے جب کفار مکہ نے مسلمانوں کے خلاف مشترکہ طور پر معاشی و معاشرتی بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ و اعلان کیا تو حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو جذبہ ایمان کے سائے میں متحد ہو کر صبر و یک جہتی کے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا چنانچہ صدر اسلام کے مجاہدین نے حضرت رسالت مآب ؐ کے حکم کے مطابق عمل کر کے اپنی صفوں میں اتحاد و یک جہتی اور صبر و تحمل پیدا کر کے اپنی اسلامی حیثیت و ملی تشخص کا تحفظ کیا جس کے نتیجے میں کلمہ توحید سربلند ہوا اور اہل اسلام سرخرو ہوئے' تو یہ کامیابی دراصل مسلمانوں کے باہمی اتحاد و یک جہتی کا نتیجہ تھی' اس سے موجودہ دور اور

ملت اسلامیہ کی مشکلات کے حل کے لیے بھی درس حاصل ہو سکتا ہے' کہ جب مسلمانوں کی تعداد کفار و مشرکین کے مقابلے میں بہت کم تھی اور دشمن ہر طرح کے اسلحہ و ہتھیاروں سے لیس بھی تھا لیکن مسلمانوں نے جذبہ ایمانی اور اخوت و برادری کے سائے میں یکجا ہو کر ان کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہو گئے تو موجودہ دور میں جب کہ مسلمانوں کے پاس خدا کی عطا کردہ نعمتیں بہت زیادہ ہیں اور اہل اسلام دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلے ہوئے ہیں تو پھر ان مشکلات پر قابو پانا کیونکر دشوار ہے' بات صرف جذبہ و احساس کی ہے' اگر ہم اپنے ایمان و عقیدہ پر قائم ہوں اور اس پر عمل پیرا ہو کر اپنی قوت کا احساس دل میں زندہ کرلیں تو دنیا بھر میں تمام مسلمان ممالک اقتصادی و سیاسی دونوں میدانوں میں مضبوط و مستحکم ہوسکتے ہیں اور مسلمانوں کے خلاف ہونے والی سازشیں دم توڑ سکتی ہیں؟

اسلام ایسا مضبوط و مستحکم آئین حیات ہے جسے ہمارے خالق نے ہمارے ہی لیے بنایا ہے اس کی تدوین و ترتیب اور تشریح و قانون سازی کا مکمل اختیار اپنے پاس رکھ کر خدا نے ہمیں اس پر عمل پیرا ہونے کا تاکیدی حکم دیا ہے کہ جسے شرعی زبان میں "تکلیف الٰہی" کہا جاتا ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ذمہ داری خداوند عالم نے ہمارے لیے معین کر دی ہے اور ہمیں اس کی عملداری کا پابند بنا دیا ہے اب یہ ہمارا تخلیقی فریضہ اور فطری فرض ہے کہ ہم اس کے حکم پر عمل کرکے اپنی دنیا و آخرت سنواریں اور مادی نعمتوں سے استفادہ کرتے ہوئے روحانی کامیابی کی راہ ہموار کریں ایک دوسرے کے حقوق کا عملی احترام کرتے ہوئے باہمی کاوش سے اپنی معاشی و معاشرتی مشکلات و مسائل کو حل کریں اور اپنے کردار سے اپنے اسلامی تشخص کی پاسداری کریں۔

اسلام نے اپنی مقدس تعلیمات میں افراد بشر کو بالعموم اور اہل ایمان کو بالخصوص اخوت و برادری کا درس دیا ہے تاکہ اسی جذبہ و احساس کے ساتھ امور زندگی انجام پذیر ہوں' اسلام کے عبادتی احکام اور اخلاقی دستورات میں اخوت و برادری کے مقدس ہدف کا حصول بنیادی ترجیح قرار پایا ہے چنانچہ اجتماعی عبادات میں اس سلسلے کو خصوصی توجہ و التفات کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے' خلاق کائنات نے انسانی طبع وجود کے تقاضوں کے عین مطابق اپنے دستورات اور تعلیمات کو بھائی چارہ کی بنیاد پر استوار کیا ہے انفرادی حقوق ہوں یا معاشرتی حقوق تمام مسائل میں اسلامی تعلیمات و احکام کا مقصد انسانوں اور مومنین کو ایک دوسرے کے بارے میں پاکیزہ احساسات پیدا کرنا قرار دیا گیا ہے' اسلام نے کسی بھی ایسے عمل کی حوصلہ افزائی نہیں کی جس سے افراد بشر کے درمیان دوری کی راہ ہموار ہو بلکہ اس طرح کے اعمال کی زبردست حوصلہ شکنی کی گئی ہے اور ایسا کرنے والوں کو سزا کا مستحق قرار دیا گیا ہے؟

اگر اسلام کی مقدس و انسان ساز تعلیمات پر عمل کیا جائے تو دنیائے انسانیت و ملت اسلامیہ عزت و عظمت اور وقار و امن کے ساتھ اپنے کاروان حیات کو ساحل سعادت و نجات تک پہنچا سکتی ہے کیونکہ اسلام ہی واحد آئین زندگی ہے جو انسانیت کی فلاح کی مکمل ضمانت دیتا ہے۔

9/5/1995

نسخہ ہدایت و سعادت

خداوند عالم نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور اسے اپنا شاہکار تخلیق ہونے کا اعزاز بخشا' خدا نے انسان کی زندگی کو راحت و آرام اور آسائش سے مالا مال کرنے کے لیے اپنی پوری کائنات کو انسان کے ارادہ و اختیار کے دائرے میں قرار دے دیا تاکہ وہ اپنی تخلیق کے بنیادی مقصد کے حصول میں کامیاب ہو سکے ' خدا نے انسان کو وہ تمام نعمتیں عطا فرمائیں جن سے استفادہ کرتے ہوئے وہ دنیا کی خوشحالی اور آخرت کی کامیابی و سعادت پاسکے مگر افسوس کہ انسان نے اپنی قدر نہ جانی اور اپنے عظیم مقام و منزلت کو بھلا دیا ابتدائے آفرینش ہی سے انسان باہمی اختلاف کا شکار ہوگیا جاہ طلبی اور تکبر نے انسان کو اپنا محکوم بنا لیا' انسان وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ چلتا رہا یہاں تک کہ قرون اولی کے ظلمانی دور سے گزرتا ہوا موجودہ ترقی یافتہ زمانہ تک پہنچ گیا کہ جسے علم و دانش اور تمدن و ثقافت کا دور کہا جاتا ہے مگر پہلے کی طرح عصر حاضر میں بھی انسان کی حیوانی خصلتیں اس کے اشرف المخلوقات ہونے کے اعزاز پر غالب رہیں۔

بظاہر یہ دور ترقی و پیش رفت کا دور ہے'۔ علم و تحقیق کے بازار میں رونق دکھائی دیتی ہے مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس دور میں بھی جہالت و متصیت اور ظلم و جور کی سیاہ آندھیاں پورے عالم انسانیت کو خوفزدہ کئے ہوئے ہیں' برائیوں کا کھلم کھلا ارتکاب ہو رہا ہے' فحاشی و بد عملی کا ایک

سیلاب پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے' دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں گناہ و معصیت کی ناپاک جڑیں معاشرے کی رگ جاں میں نہ پھیل چکی ہوں'

اب دیکھنا یہ ہے کہ جہالت و معصیت کے اس دور میں اہل ایمان کی کیا ذمہ راری ہے؟ اس سلسلے میں ہمارے سامنے حضرت پیغمبر اسلام محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ "نسخہ ہدایت و سعادت" ہے جو حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالہ سے ہم تک پہنچایا' اس نسخہ ہدایت پر عمل کرکے معاشرے کی اصلاح اور اس سے برائیوں کا خاتمہ کرنے میں یقینی مدد مل سکتی ہے آنجناب ؑ نے ارشاد فرمایا:

"اے اہل ایمان! جو شخص گناہ و معصیت کے ارتکاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھے اور یہ بھی دیکھے کہ نہ صرف برائیوں کا ارتکاب ہو رہا ہے بلکہ دوسروں کو گناہ کی دعوت دینے والی شیطانی قوتیں بھرپور طور پر مصروف عمل ہیں تو اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے دل ' زبان اور قوت بازو سے برائیوں کا راستہ روکے' دل سے برائیوں کو روکنے کا طریقہ یہ ہے کہ گناہ و معصیت سے شدید نفرت کرے' اگر اس نے ایسا کرلیا تو وہ خود بھی برائیوں کے ناپاک آثار سے محفوظ رہے گا اور دوسروں کو بھی اس سے دور رکھنے میں کامیاب ہو جائے گا' دل میں برائیوں سے نفرت کرنے کے بعد باطنی جذبات و احساسات کا اظہار اپنی زبان سے کرے' تو جو شخص ایسا کرلے وہ دنیا و آخرت میں اجر و ثواب پائے گا ایسا شخص دل میں گناہوں سے نفرت کرنے والوں سے ایک درجہ بہتر ہے' دل اور زبان سے گناہ و معصیت سے دوری اختیار کرنے والے شخص سے زیادہ بلند مقام و مرتبہ اس شخص کو حاصل ہے جو اپنی قوت بازو سے استفادہ کرتے ہوئے تلوار

ہاتھ میں لے کر میدان عمل میں کود پڑے اور ظلم و جور کے خلاف بر سر پیکار ہو جائے' تو جو شخص ظالموں' بدکاروں اور ستم پروروں کی بیخ کنی اور معاشرے کی اخلاقی و روحانی جڑیں کاٹنے والوں کے مقابلے میں اسلحہ اٹھا کر صرف اور صرف اس لیے قیام کرے کہ اللہ کے احکام کی سربلندی ہو تو ایسا شخص خود بھی ہدایت یافتہ ہو گا اور اپنے دل کو نور حقیقت سے منور کر کے دوسروں کو بھی سعادت و فلاح کی پاکیزہ راہ دکھانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

آنحضرتؐ کے اس نسخہ ہدایت و سعادت سے اس امر کی آگاہی ملتی ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعے ہی معاشرے میں معصیت کی پھیلتی ہوئی گندگی کو دور کیا جا سکتا ہے' دل میں برائیوں سے نفرت ایک نفسیاتی عمل ہے جس کا اثر فکر و نظر کی تمام قوتوں پر ہوتا ہے ان قوتوں میں سے ایک قوت گویائی یا قوت اظہار عقیدہ ہے اس کے ذریعے انسان اپنے ماضی الضمیر' اپنے باطنی جذبات و احساسات' اپنے خیالات و افکار اور اپنے نظریہ و اعتقاد کو دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے' برائیوں کی بابت دل میں پیدا ہونے والی نفرت کا اظہار پسندیدہ عمل ہے اور ایسا کرنے والے دنیا و آخرت میں احترام و بلند مقام و مرتبہ پاتے ہیں' اگر اس نسخہ سعادت پر عمل کیا جائے تو معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کا قلع قمع کرنے کی راہ ہموار ہو سکتی ہے' اور جہاں تک قوت بازو سے استفادہ کرنے کا تعلق ہے تو یقینا یہ آخری مرحلہ ہے کہ جب برائیوں کا خاتمہ کسی بھی دیگر قوت کے استعمال سے ممکن نہ ہو تو قوت بازو کو کام میں لایا جائے اس میں جو اہم ترین شرط رکھی گئی ہے وہ دراصل اس عمل کی اصل روح ہے یعنی قوت بازو کے استعمال میں صرف اور صرف رضائے پروردگار اعلائے

کلمہ حق اور ظالم و باطل قوتوں کی سرکوبی و بیخ کنی ہی ملحوظ و مقصود ہو'

عصر حاضر میں انسانیت کے نام پر دہشت گردی کا بازار گرم ہے لہٰذا اس سے نمٹنے کا ایک ہی طریقہ ہے جس سے اس گھناؤنے کھیل کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ تمام افراد برائیوں' بداعمالیوں اور فحاشیوں کے خلاف مشترکہ جدوجہد کریں اور اپنے تمام وسائل بروئے کار لاکر معاشرے کی اصلاح کے لیے ضروری اقدامات کریں اسلام کی بنیادی تعلیمات میں جو اہم ترین عنصر موجود ہے وہ خلق خدا کی خیرو صلاح ہے اس کے لیے قرآن مجید کی متعدد آیات واضح طور پر اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ خدا نے اپنے ہر حکم کا نتیجہ لوگوں کی فلاح و بہبود کو قرار دیا ہے' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حکم کا نتیجہ بھی یہی ہے کہ افراد بشر ایک دوسرے کو نیکی کا راستہ دکھاتے ہی نہیں بلکہ نیکی اختیار کرنے کا حکم دیں اور برائی سے دور رہنے کی تاکید کریں جس سے معاشرہ اپنی اصل حیثیت اور قوت و استحکام کے حصول و تحفظ میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

اگر ہم چشم انصاف اور نگاہ فطرت سے دیکھیں تو اس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ کوئی شخص بھی معاشرے میں برائیوں کا فروغ نہیں چاہتا بلکہ جس سے بھی پوچھیں وہ برائیوں سے نفرت کا اظہار کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن اسلامی تعلیمات میں کسی بھی برائی سے نفرت کا یہ اظہار کافی نہیں قرار دیا گیا بلکہ عملی طور پر اس سے دور رہنے اور دوسروں کو اس سے دور رکھنے کا حکم بھی دیا گیا ہے' اسی طرح صرف نیکی کی تعریف یا نیکی سے محبت کا اظہار بھی کافی نہیں اسے عملی طور پر اپنانے اور دوسروں کو اسکی ترغیب دلانے کا حکم بھی دیا گیا ہے تاکہ فضیلتوں سے محبت کا فطری جذبہ بھی پورا ہو جائے اور انسانی

معاشرہ مضبوط و مستحکم بنیادوں پر قائم ہو کیونکہ جس معاشرے میں نیکی سے محبت اور برائی سے نفرت کا عملی مظاہرہ ہو وہ کسی بیرونی دشمن کے ہاتھوں غیر مستحکم نہیں ہو سکتا۔

عام طور پر یہ بات مشاہدہ میں آئی ہے کہ قوموں کا زوال ان میں پائی جانے والی برائیوں کے پھیلاؤ کے سبب ہوا اور چونکہ ان لوگوں نے نہ صرف یہ کہ برائیوں سے خود اجتناب نہیں کیا بلکہ اس کے فروغ کے لیے ہونے والی کوششوں کو ناکام بنانے کے بجائے ان میں خود شریک ہوئے جس کے نتیجے میں خداوند عالم نے ان قوموں کو تاریخ میں برئی کی علامت قرار دیا چنانچہ قرآن مجید میں ان فاسد اقوام کے قصے موجود ہیں مثلاً حضرت لوطؑ کی قوم کا انجام رہتی دنیا تک آنے والی نسلوں کے لیے عبرت بن گیا' ان کی تباہی ان کے اپنے ہاتھوں انہی اعمال کے نتیجے میں ہوئی جن سے حضرت لوطؑ بحکم خدا انہیں منع فرماتے تھے لیکن ان لوگوں نے خدا کے نبی کی باتوں پر کان نہ دھرے اور بالآخر تاریخ میں ایک قبیح ترین عمل ان کے نام سے موسوم ہوگیا' اسی طرح کئی دیگر اقوام کے حالات و احوال اور انجام سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ امربالمعروف اور نہی از منکر کے ترک سے لوگوں میں نیکی سے دوری اور برائی سے قرب کو فروغ ملا اور معاشرتی قدریں پامال ہوگئیں اسی لیے تمام افراد معاشرہ کو اس بات کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے کہ وہ اخلاقی و معاشرتی امور میں باہمی تعاون کے ساتھ کام کریں اور ہر شعبہ حیات میں نیکی کے رجحان کو فروغ دینے اور برائی سے اجتناب و نفرت کا احساس و جذبہ پیدا کرنے کے لیے تمام وسائل بروئے کار لائیں اور اس بات کا پورا پورا خیال رکھیں کہ امربالمعروف اور نہی عن المنکر میں کسی فرد یا گروہ

کے شخصی و اجتماعی حقوق کو ٹھیس نہ پہنچے بلکہ تمام افراد کے احترام و اکرام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے مسلمہ انسانی و اسلامی حقوق کا تحفظ ہو کیونکہ اگر کسی کے حقوق کی پامالی کا خطرہ یا اندیشہ لاحق ہو تو معاشرے میں مفاہمت کی بجائے مخاصمت کی فضا قائم ہو جائے گی لہٰذا جو حضرات امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کے لیے میدان عمل میں کودیں ان کے لیے نہایت ضروری ہے کہ وہ ہر فرد کی معاشرتی حیثیت کا پورا پورا خیال رکھیں اور اپنی توانائیاں بروئے کار لاتے ہوئے اسلامی اصولوں کے عین مطابق ایسی روش اپنائیں جس سے گناہ و معصیت کی راہ روکی جاسکے اور معاشرے سے جہالت و معصیت کی تاریکی دور کی جاسکے۔

حضرت پیغمبر اسلامؐ کے نسخہ ہدایت و سعادت کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام افراد معاشرہ اپنی حدود و استطاعت و امکان میں برائیوں سے دوری اختیار کرنے کا عزم بالجزم اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بھرپور اقدامات کریں تاکہ انفرادی و معاشرتی دونوں امور خدا کے بتائے ہوئے پاکیزہ اصول حیات سے ہم آہنگ ہو سکیں' اس نسخہ ہدایت و سعادت پر عمل پیرا ہو کر ہر فرد اپنے ماحول کی فاسد فضا کو ختم کر کے روحانیت کے عمومی نفاذ کو یقینی بنا سکتا ہے اسی لیے خداوند عالم نے لوگوں کو حضرت پیغمبر اسلامؐ کی مکمل اطاعت اور ان کی پاکیزہ تعلیمات کو زندگی کی اساس و بنیاد قرار دینے کا حکم دیا ہے کیونکہ ان کا سلسلہ مصدر فیوضات و سرچشمہ ہدایت و سعادت یعنی ذات کردگار سے ملتا ہے لہٰذا ان کے ہر پہلو میں افراد بشر کی صلاح و فلاح پائی جاتی ہے۔

یکم اگست ۱۹۹۷

شہادت: ابدی حیات

(شہید ہمیشہ زندہ ہے)

(محرم الحرام کی مناسبت سے خصوصی تحریر)

☆ شہادت ابدی حیات کا دوسرا نام ہے۔

☆ شہید موت کے فنا شعار مفہوم کو بقا و دوام کے سائے میں ڈھال دیتا ہے۔

☆ شہید کی زندگی کا ادراک انسانی مادی فکر کے دائرے سے ماوراء ہے۔

☆ شہید کو مردہ نہ کہو وہ تو زندہ اور خدا کے پاس رزق پاتا ہے۔

یہ سب کچھ قرآنی حقائق کی ایک جھلک ہے۔ معنی و مفہوم کی حد تک بہت سی حقیقتیں عقیدت کے پردوں میں چھپ کر اپنے وجود کا یقین دلاتی ہیں مگر جب ان کے مصداق کا مشاہدہ مطلوب ہو تو فطرت کے جذبے مچلتے ہیں اور فکر و نظر کی روح، تحقیق و جستجو کے بستر پر کروٹیں لیتی ہے۔ ایسے میں احساس کی نظریں مجاز کے دبیز پردوں میں پوشیدہ حقیقتوں کا مسکن ڈھونڈ پاتی ہیں اور جن چیزوں کا وجود شعور کی سرحد پار کے علاقہ غیر کا حصہ سمجھا گیا تھا، اس کا لمس جان و

دل میں تازگی پھیلا دیتا ہے۔ ایسی ہی پاکیزہ اور پاک حقیقتوں میں سے ایک حقیقت کا عام فہم نام "شہادت" اور خاص فہم نام "ابدی حیات" ہے۔

زندگی کو ابدیت اور ہمیشگی کا اعزاز شہید کے ذریعے حاصل ہوتا ہے ورنہ عام طور پر روح کے بدن سے خاص تعلق کے دورانیہ کو زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے جب کہ زندگی اس سے کہیں بالاتر مفہوم رکھتی ہے۔ اصل زندگی تو مقصد کی تکمیل سے عبارت ہے۔ انسان کو دنیا میں کیوں خلق کیا گیا؟ اس کا عملی جواب تخلیق کے ہدف کے حصول کے ذریعے دیا جائے تو اسے زندگی کا تحفظ کہا جاتا ہے۔ زندگی ایک نعمت ہے جو خالق کی خاص عطا ہے۔ اس نعمت کا حصول اختیاری نہیں مگر اس کی بقا میں انسان کے اختیار کا دخل ضرور ہے۔ اگر کوئی شخص اس نعمت کو ہمیشہ اپنے پاس رکھنا چاہے تو یہ بات اس کے لیے ممکن ہے۔ مقصد تخلیق کی تکمیل انسان کو ہمیشہ کی زندگی عطا کرتی ہے اور جو انداز ہائے خاص اس نعمت کی بقا و دوام کی ضمانت فراہم کرتے ہیں' ان میں سے ایک شہادت ہے۔

شہادت دراصل زندگی کے خالق کے حضور ہمہ تن حضوری کا نام ہے۔ گفتار میں' کردار میں' خلوت میں' جلوت میں' جان سے' روح سے اور خود سے اور خودی سے' اسے دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ شہادت اپنا سب کچھ دے کر سب کچھ لینے کا روحانی معاہدہ ہے کہ جس پر عمل پیرا ہونے والا اس کے سعادت کیش آثار سے لطف اندوز ہونے میں کامیاب ہوتا ہے۔ مقصد حیات کی تکمیل کے دو بنیادی اسباب ہیں۔ ایک خدا کی طرف سے حاصل ہونے والی خاص توفیق اور دوسرا انسان کا اپنا پختہ ارادہ و عزم صمیم' البتہ دوسرے

سبب کی حیثیت اس طرح کی ہے کہ پہلے سبب کا راستہ بھی اسی سے ملتا ہے۔ اگر انسان کے اپنے ارادے میں پختگی نہ ہو تو خدا کی طرف سے توفیق بھی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ خدا جبر کا عمل نہیں کرتا بلکہ جبر و تفویض کے درمیانی انداز کو اپناتا ہے یعنی ارادہ خود انسان کرتا ہے اور خدا اس کے ارادے کی پختگی کی بنیاد اس کی تکمیل کا راستہ آسان کر دیتا ہے' اسی حوالہ سے معاہدہ کی دونوں طرفیں اپنے فرائض بخوبی سرانجام دیتی ہیں کیوں کہ معاہدہ یک طرفہ نہیں ہوتا اس لیے اگر خدا کی توفیق ہی علت تامہ ہو اور انسان کے ارادے کا وجود و عدم برابر ہوں تو جبر لازم آئے گا۔ یہی صورت حال دوسری جانب ہے کہ انسان کا ارادہ اور اس میں پختگی تبھی رنگ لاتی ہے جب اسے خدا کی توفیق حاصل ہو جائے لیکن خدا چونکہ عادل ہے اس لیے وہ کسی انسان کے پختہ ارادے پر توفیق کے اعطاء کا عمل ہرگز نہیں روکتا بلکہ وہ اس کے لیے آسانیاں پیدا کر دیتا ہے۔

شہید کا مقام معاشرے میں اس چراغ کی مانند ہے جو خود تو جلتا رہتا ہے مگر دوسروں کو روشنی دینے میں مصروف ہوتا ہے۔ شمع سے مثال اسی حوالہ سے دی گئی ہے۔ کہ شہید اپنی عظمت کے وجود سے معاشرے کو منور کرتا ہے خود جل جانا پسند کرتا ہے مگر معاشرے کو جلا عطا کرتا ہے۔ بنا برایں شہید اپنی جان کا نذرانہ دے کر دوسروں کی جانوں کو بچا لیتا ہے بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ وہ اپنی جان ہمیشہ کے لیے بچاکر اپنے مقصد حیات کی حفاظت اور تخلیق کے ہدف کی تکمیل کرتا ہے یا اس سے بھی بالاتر یہ کہ وہ کائنات کی وجودی حقیقت کو فنا و زوال پذیری سے بچاکر بقا و دوام سے ہم رنگ کر دیتا ہے اور زندگی کی لذتوں سے بہرہ مند ہونے والوں کو ہمیشہ کی آسائشوں اور زوال ناشناس عیش و راحت کی

راہ دکھاتا ہے اور انہیں زندہ رہنے کے زندہ اصول بتاتا ہے بلکہ ہمیشہ زندہ رہنے کا عملی ڈھنگ سکھاتا ہے۔ زندگی کی پاکیزہ قدروں سے روشناس کراتا ہے۔ بھولے ہوئے معیاروں کی یاد تازہ کرتا ہے اور فطرت سلیمہ کے جمالیاتی پہلوؤں اور کمالیاتی جہتوں سے آشنا کرتا ہے' ان تمام حقائق کی زندہ دلیل محرم ۶۱ھ کے پہلے عشرے میں ہونے والے اس معرکہ حق و باطل میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے والوں کے عزم صمیم سے ملتی ہے جو نواسہ رسولؐ حضرت امام حسینؑ کی طرف سے یزید بن معاویہ کی غاصبانہ و آمرانہ سلطنت کو تسلیم کرنے سے انکار کے باعث پیش آیا۔ تاریخ کے اس خونیں واقعہ سے شہادت کا بلند مقام و مرتبہ اور شہید کی عظمت رہتی دنیا تک آنے والی نسلوں کے سامنے آشکار ہو گئی اور ابدی حیات کا مفہوم واضح ہوگیا۔ حضرت امام حسینؑ اور ان کے ساتھی شہید ہوگئے' ان کی لاشوں پر گھوڑے دوڑائے گئے اور ان کے پارہ پارہ جسموں کو پامال کرکے فتح و شادمانی کے نقارے بجاتے ہوئے ان مظلوم شہیدوں کی پردہ دار مستورات اور معصوم بچوں کو اسیر کرکے بازاروں میں پھراتے ہوئے بھرے دربار میں لاکر توہین آمیز ماحول میں لایا گیا اور پھر تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں بند کر دیا گیا مگر اس سب کچھ کے باوجود صحرائے کربلا میں شہید ہونے والوں کا نام اور مشن اب تک زندہ ہے۔ ان کی یاد دلوں میں تازہ ہے اور ان کا ذکر ہر شخص کی زبان پر جاری ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ انہوں نے پختہ ارادے کے ساتھ خدا کے دین اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کو بچانے کے لیے اپنی جانیں قربان کیں اور ابدی حیات پانے کے لیے ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دی۔ جس کے نتیجے میں آج ان کا نام روشن ان کا تذکرہ باقی اور ان کا مشن

زندہ ہے۔ آج عزت کے ساتھ زندہ رہنے کے خواہاں ان کا ذکر کرکے اور ان کی یاد کے چراغ دلوں میں روشن کرکے دنیا بھر میں سکون و اطمینان قلب حاصل کرتے ہیں۔

کربلا کے شہیدوں نے تاریخ کا رخ فطری حقیقتوں کی طرف موڑ کر بنی نوع آدم کو ابدی حیات کے تابندہ اصولوں سے آشنا کیا اور مادی زندگی کی رنگ رلیوں میں مدہوش افراد کو روحانی حیات کی ابدیت نواز آسائشوں سے مانوس کیا۔ جس کے نتیجے میں آج ہر قوم کی زبان پر ان کا قصہ ہے اور ہر شخص ان کے گیت گاتا ہے کیونکہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ محسن کو یاد رکھا جائے اور اس کے احسانات کو بھی یاد کیا جائے۔ حضرت امام حسینؑ انسانیت کے محسن ہیں وار ان کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے حق و باطل اور سچ و جھوٹ کی تمیز کروائی ہے۔ آزادی و غلامی کے اصل معانی و مفاہم کو آشکار کیا ہے اور عزت و ذلت کی زندگی کے درمیان فرق کا عملی نمونہ پیش کرکے ہر قوم و ملت کو درس زندگی دیا۔ اس حوالہ سے امام حسینؑ ہمیشہ زندہ ضمیر لوگوں کے رہبر کی حیثیت میں یاد رہیں گے۔

شہید اعظم حضرت امام حسینؑ نے کربلا میں جو خطبے دیئے اور اپنے قیام و جہاد کی حقیقتوں اور مقاصد کو واضح طور پر بیان کیا' ان سے ایک ایسے عزت بخش آئین حیات کا ثبوت ملتا ہے کہ جسے اپنا کر دنیا میں ظلم و استبداد اور فسق و فجور' ناانصافی و بے عدالتی اور آمریت و باطل پرستی کا راستہ روکا جا سکتا ہے۔ حریت و آزادی کا جو پیام اور درس حضرت امام حسینؑ نے صحرائے کربلا میں دیا۔ اس میں انسانی حقوق کی پاسداری اور معاشرے میں امن و سلامتی کی ضمانت موجود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر دنیائے انسانیت میں امام حسینؑ کے عظیم منشور و آئین کو عملی طور پر نافذ کر دیا جائے تو نہ ہی کوئی قومی و علاقائی تنازعات باقی رہیں اور نہ ہی رنگ و نسل اور زبان کے حوالہ سے جھگڑے ہوں بلکہ جغرافیائی حدود کی غیر حقیقی تقسیم کا وسیع سلسلہ ختم ہو کر وحدت و اتحاد کی ایسی دنیا آباد ہو جائے جس سے ہر شخص دوسرے کو انسانیت کے آئینہ میں دیکھے اور جو کچھ اپنے لیے سوچے اور پسند کرے وہی دوسرے افرادِ بشر کے لیے پسند کرے۔ درحقیقت یہی درس ہے شہید اعظم حضرت امام حسینؑ اور ان کے باوفا ساتھیوں کا' اگر ہم کربلا کے واقعہ کی بابت منصفانہ تجزیہ کریں اور اس کے پس منظر و پیش منظر کا وسعت نظری کے ساتھ جائزہ لیں تو اس منفرد حادثہ کی اصل حقیقت واضح ہو جائے گی اور یہ بات کھل کر سامنے آ جائے گی کہ امام حسینؑ کسی اقتدار و حکومت کے حصول کے لیے میدان میں نہیں گئے تھے کیوں کہ یزید نے اس طرح کی پیشکش کئی بار کی اور حکومت میں حصہ دار بنانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر نواسہ رسولؐ نے ناجائز عمل میں شرکت یا اس کی حمایت کرنے سے قطعی انکار کرتے ہوئے واضح طور پر کہہ دیا کہ "مجھ جیسا اس جیسے کی بیعت نہیں کر سکتا" اور اپنے اس عظیم مؤقف کے اظہار سے ایک ٹھوس ضابطے کی بنیاد رکھ دی جس سے اس طرح کی بیعتوں کے مطالبوں کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ واقعہ کربلا کے بعد کسی غیر معصوم حاکم و سلطان نے طاقت کے زور پر کسی معصوم سے بیعت کا مطالبہ نہیں کیا اور یہی بات امام حسینؑ کی فتح کی روشن دلیل ہے۔ اسی حوالہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شہید اپنے مشن میں زندہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور جب تک اس کے شہید ہونے کی اصل غرض باقی

ہے اسے زندہ ہی کہا جائے گا' مردہ نہیں لہٰذا اسلام کا وجود اور انسانی اقدار کا احترام درحقیت شہید اعظم امام حسینؑ کی ابدی حیات اور ہمیشہ کی زندگی کی واضح دلیل ہے اور قیامت تک اسلام و انسانیت کے ساتھ ساتھ امام شہید کا نام بھی زندہ رہے گا۔

تقلید اور اس کی افادیت' ضرورت اور شرائط

خداوند عالم کے احکام و فرامین اور عملی دستورات پر عمل کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔ زندگی کے تمام امور میں تعلیمات الہیہ کو بنیاد قرار دینا لازمی ہے۔ چونکہ ہر شخص ان احکام کا علم نہیں حاصل کرسکتا لہٰذا جو خود ان دستورات کو قرآن و سنت سے حاصل نہ کرسکتا ہو اس پر "تقلید" کا فریضہ عائد ہو جاتا ہے یعنی وہ اس ماہر شخص کے تحقیقی نقطہ نظر کہ جسے فتویٰ کہا جاتا ہے' پر عمل کرے۔ جس نے حکم خدا کو اچھی طرح سمجھ کر حاصل کیا ہو' ایسے شخص کو "مجتہد" کہا جاتا ہے' وہ اپنے اجتہاد یعنی بھرپور علمی کاوش سے خدا کے فرامین کو قرآن و حدیث صحیحہ سے حاصل کرتا ہے۔ اس کا فتویٰ درحقیقت اس کی تحقیق کا نچوڑ ہوتا ہے اس لیے اس پر عمل کرنا ہر اس شخص کے لیے صحیح اور کافی ہے جو خود اس قدر علمی صلاحیت نہ رکھتا ہو کہ قرآن و سنت سے احکام کا ادراک کرلے۔

موجودہ ترقی یافتہ دور میں کسی مجتہد کا فتویٰ معلوم کرنے کے ذرائع بہت زیادہ ہیں لیکن جو اہم نکتہ اس میں پوشیدہ ہے' وہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں یقین

حاصل ہونا چاہیے کہ یہ مجتہد کا ہی فتویٰ ہے۔ عین ممکن ہے کسی ایک شخص کے قول سے یہ یقین حاصل ہو جائے تب بھی کافی ہے یا مجتد کے فتاویٰ پر مشتمل کتاب پڑھ کر یقین حاصل ہو یا خود بالمشافہ پوچھ کر یقین حاصل ہو تو تمام امور میں عمل درست اور کافی ہے۔ ٹیلی فون' فیکس' ای میل' انٹرمیڈیٹ اور دیگر ذرائع سے اگر یقین حاصل ہو جائے تب بھی اس کے مطابق عمل کیا جا سکتا ہے۔

کسی کے مجتہد ہونے کی تشخیص تقلید کی اہم ترین بنیاد ہے اس سلسلے میں بھی یقین یا اطمینان حاصل ہونا ضروری ہے۔ عین ممکن ہے کوئی شخص خود عالم ہو اور کسی کے مجتہد اور جائز التقلید ہونے کی تشخیص کر سکے۔ ایسے شخص کے لیے اس کی اپنی تحقیق و تشخیص کافی ہے۔ اس کے علاوہ اگر دو عادل عالم گواہی دیں یا ایک عادل عالم کے بیان سے یقین حاصل ہو جائے تب بھی کافی ہے یا شہرت عام ہو کہ جس پر اطمینان حاصل ہو جائے تو اس کی بنا پر تقلید جائز ہو گی۔

مجتہد چونکہ خدا کے احکامات لوگوں تک پہنچانے کا ذریعہ ہوتا ہے اس لیے اس میں علمی صلاحیت کے ساتھ ساتھ امانت' صدق' عدالت اور کمال تقویٰ و دیانت کا پایا جانا ضروری ہے۔ ان امور و صفات کے بغیر اس کے اجتہاد اور صرف علمی و تحقیقی کاوشوں کو کافی نہیں سمجھا جا سکتا' اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ غیر معصوم ہوتا ہے اور اس سے خطا بھی سرزد ہو سکتی ہے لیکن عمداً" غلطیاں کرنے والے یا شہرت' حب ریاست اور جاہ و دولت کے لالچی کی بات پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ جس مجتہد کی تقلید کی جائے۔ وہ "عادل" ہونے کی تمام شرائط پر پورا اترتا ہو' خدا کی رضا و اطاعت کے علاوہ

کوئی دوسری چیز اس کے مد نظر و ملحوظ خاطر نہ ہو' اس کے علاوہ اس کا صحیح النسب اور صحیح العقیدہ ہونا بھی ضروری ہے ورنہ اس کی تقلید جائز نہ ہوگی کیونکہ اس کا مقام و مرتبہ معصوم امام کی نیابت کا ہے لہٰذا اس کا حسب' نسب' علم' عقیدہ اور عمل کے حوالوں سے کامل ہونا ضروری ہے۔ عین ممکن ہے ایک دور میں کئی مجتہدین موجود ہوں لہٰذا ان میں سے جس کی تقلید بھی اختیار کرلی جائے۔ صحیح و کافی ہے ضروری نہیں کہ جس کی تقلید کریں' وہ دنیا میں موجود تمام مجتہدین میں سب سے زیادہ علم رکھنے والا ہو کیونکہ ایسے شخص کی تشخیص نہایت مشکل ہے بالخصوص موجودہ مادی دور میں تو یہ کام نہایت دشوار ہے کسی شخص کے "اعلم" ہونے کی تشخیص ہرگز نہیں ہو سکتی' بنا برایں اسی قدر کافی ہے کہ وہ علمی صلاحیت اور عملی و اعتقادی اہلیت رکھتا ہو۔

اگر کوئی شخص کسی مجتہد جامع الشرائط کی تقلید کرلے اور وہ فوت ہو جائے تو جب تک کسی دوسرے زندہ مجتہد کی تشخیص کے بعد اس کی تقلید اختیار نہیں کرتا' اپنی سابقہ تقلید پر باقی رہ سکتا ہے البتہ جدید مسائل میں کسی دوسرے مجتہد کی تقلید ضروری ہوگی' ایک مجتہد کی تقلید چھوڑ کر دوسرے مجتہد کی تقلید کرنے میں دونوں کی شرائط کے بارے میں نہایت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ جذبات اور افواہوں کی بنیاد پر اس طرح کے فیصلے کا جواز پیدا نہیں ہو سکتا اور نہ ہی سیاسی حالات کو تقلیدی مسائل کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔ مرجع تقلید یعنی وہ مجتہد جس کی طرف شرعی احکام میں تقلید کے لیے رجوع کیا جائے اس میں علمی' اعتقادی اور عملی اہلیت کی شرائط کا پایا جانا کافی ہے۔ اس کا حکومتی اعلیٰ عہدہ پر فائز ہونا ضروری نہیں بلکہ عین ممکن ہے کہ حکومتی تائید اس کی اہلیت کو

مشکوک کر دینے کا سبب بن جائے' تقلید کا تعلق فروع دین اور شرعی احکام و عملی دستورات سے ہے کہ ان میں مجتہد جامع الشرائط کا فتویٰ مقلدین کے لیے حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے جہاں تک اصول دین و اعتقادات کا تعلق ہے تو ان میں تحقیق ضروری ہے تاہم بزرگ علماء و مجتہدین کی تحقیقات سے ہدایت و رہنمائی سب سے بہتر ذریعہ ہیں۔ ان سے ان مسائل میں بھی رجوع کیا جا سکتا ہے تاکہ ان کی علمی کاوشوں سے عقیدہ کی صحت یقینی بنائی جا سکے' اعتقادی مسائل میں ان کی طرف رجوع کرنے کو اصطلاحی طور پر تقلید اس لیے نہیں کہا جاتا کہ ان کا نقطہ نظر حرف آخر نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ اس پر بحث و تحقیق اور نقد دن اور نقد و نظر کی پوری طرح آزادی و گنجائش موجود ہوتی ہے جب کہ فروع دین میں ان کا نقطہ نظر سند قرار پاتا ہے کہ جس کی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اس پر کسی دوسرے نقطہ نظر کی گنجائش ہوتی ہے' مجتہدین کرام چونکہ علمی مقام میں بلند حیثیت رکھتے ہیں لہٰذا اصول عقائد میں ان سے رہنمائی لینا نہایت مستحسن اور مفید ثابت ہو سکتا ہے بالخصوص ان لوگوں کے لیے کہ جو خود تحقیق نہیں کر سکتے' خلاصہ کلام یہ کہ عبادات و فرائض میں مجتہدین کرام چونکہ امام معصوم کی نیابت کا مقام رکھتے ہیں لہٰذا ان کے فتاویٰ پر عمل کرنا لازمی ہے جب کہ اعتقادات و نظریات کہ جن کا تعلق عملی مرحلہ سے نہیں ہوتا۔ ان میں مجتہدین سے بہتر کون رہنمائی کر سکتا ہے؟ عبادات خواہ جسمانی ہوں یا مالی' دونوں میں مجتہدین کی تقلید ضروری و کافی ہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مجتہدین کے فتاویٰ سے آگاہ ہونے کے بعد ان پر عمل کرنے کے لیے مزید کسی اجازہ وغیرہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی مثلاً" مجتہد نے فتویٰ دیا کہ نماز کی تیسری

اور چوتھی رکعتوں میں سورت کی بجائے تسبیحات اربعہ پڑھنا کافی ہے تو نماز گزار اس فتویٰ پر عمل کرتے وقت دوبارہ ان سے پوچھنے کا پابند نہیں' یا یہ کہ غصبی مکان و لباس میں نماز جائز نہیں تو اب اگر مقلد کو یقین حاصل ہو کہ یہ جگہ یا لباس غصبی ہے تو اس میں نماز پڑھنے یا نہ پڑھنے کے لیے اجارہ کی ضرورت نہیں' اسی طرح مالی عبادات میں جب مجتہد فتویٰ دے کہ مال خمس یا زکوٰۃ وغیرہ کہاں کہاں خرچ ہو سکتا ہے اور مقلد کو ان موارد میں سے کسی کا یقین حاصل ہو جائے تو اسے ادائیگی میں دوبارہ مجتہد سے پوچھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی البتہ اگر مقلد خود احتیاط کرنا چاہے تو یہ اس پر موقوف ہے تاہم اگر مصرف کا یقین ہو تو ادائیگی کر کے شرعی فریضہ میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے (اس سلسلے میں تفصیلی بحث مالی عبادات کے مقام میں ہوگی) یاد رہے کہ جو شخص خود مجتہد نہ ہو اور نہ ہی احتیاط پر عمل کر سکتا ہو' اس کا کوئی عمل تقلید کے بغیر صحیح نہ ہوگا۔ لہٰذا عوام الناس پر لازم ہے کہ وہ اپنے اعمال کی صحت کو یقینی بنانے کے لیے تقلید کا فریضہ پورا کریں۔

۱۲ / ستمبر ۱۹۹۸ء

شہادت امام حسینؑ، تاریخ انسانیت کا المناک واقعہ

۶۱ ہجری کو صحرائے کربلا میں رونما ہونے والا المناک واقعہ انسانی تاریخ کا منفردِ سانحہ ہے۔ نواسہ رسول حضرت امام حسینؑ اپنے باوفا و جاں نثار ساتھیوں سمیت نہایت سفاکی و بے دردی کے ساتھ شہید کر دیئے گئے۔ انہیں تین دن تک پیاسا رکھا گیا، دریائے فرات پر پہرے لگا دیئے گئے تاکہ پیغمبر اسلامؐ کے اہل بیت کو پانی سے محروم رکھا جائے اور وہ شدت گرسنگی و تشنگی کے باعث یزید کی بیعت کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ معصوم بچوں کی آہوں، سسکیوں اور ہچکیوں کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا اور خواتین کی فریادوں کی کوئی پرواہ نہ کی گئی، امام حسینؑ کے کڑیل جوان فرزند علی اکبرؑ کی لاش کے ٹکڑے کر دیئے گئے۔ عباسؑ علمدار کے بازو قلم کئے گئے، قاسمؑ کی لاش تیروں و نیزوں سے چھلنی کر دی گئی اور ننھے شیر خوار اصغرؑ کے گلے سے تیر پار کیا گیا مگر امام حسینؑ اپنے برحق مؤقف پر قائم رہے۔ ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آنے پائی بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ مصائب و آلام جس قدر بڑھتے گئے اسی قدر امام حسینؑ کے نظریہ و موقف میں پختگی آتی گئی چنانچہ جب چاروں طرف سے مصائب نے گھیرا کر لیا تو امام نے بارگاہ خداوندی میں اس طرح اپنی محبت کا اظہار کیا:

اِلٰهی تَرَکْتُ الْخَلْقَ طُرًّا فِی هَوَاكَ
وَاَیْتَمْتُ الْعِیَالَ لِکَی اَرَاكَ
وَلَو قَطَّعْتَنِی فِی الْحُبِّ اِرْبًا اِرْبًا
لَمٰا حَنَّ الْفُوَاُد اِلٰی سِوَاكَ

(پروردگار! میں نے تیری محبت میں پوری کائنات کو چھوڑ دیا ہے اور میں تیرے دیدار کے شوق میں اپنے بچوں کو یتیم کر رہا ہوں۔ اگر تو اس محبت میں میرے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دے تب بھی میرا دل تیرے سوا کسی طرف نہیں جھکے گا۔)

خدا سے محبت اور دیدار محبوب کا شوق جس طرح امام حسینؑ نے پورا کیا۔ اس کی نظیر انسانی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ ورنہ کون ہے جو دنیا کی عیش و عشرت اور راحت و آرام کو چھوڑ کر صحرا و بیابان کی سختیاں جھیلتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ یزید نے امام حسینؑ کو ہر طرح کی پیشکش کی اور اقتدار حکومت میں شریک کار ہونے کے لیے ہر قسم کا لالچ دیا مگر آپ نے یہ کہہ کر اس کی ہر پیشکش کو ٹھکرا دیا کہ "میں موت کو سعادت اور ظالموں کے ساتھ زندگی گزارنے کو ذلت و تباہی کے سوا کچھ نہیں سمجھتا" حقیقت بھی یہی ہے کہ اصل زندگی تو وہ ہے جو عزت کے ساتھ ہو اور جس زندگی میں عزت ہی نہ ہو، وہ اصل موت ہے اسی فلسفہ حیات کے پیش نظر نواسۂ رسولؐ حضرت امام حسینؑ نے ہر طرح کے مصائب و آلام کو برداشت کرلیا مگر ظالموں کے ساتھ زندگی گزارنا قبول نہ کیا۔ امام حسینؑ کا فلسفہ حیات آج تک زندہ قوموں کے لیے معیار عمل ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں ظلم و جور اور استبداد و آمریت کی آندھیاں چلتی ہیں

وہاں عدل و امن اور استقلال و حریت کی تحریکیں شروع ہو جاتی ہیں اور عزت و آزادی کے حصول کے لیے بیش بہا قربانیاں دی جاتی ہیں۔ اسی تحریک ھای آزادی کی اصل روح اور حقیقی بنیاد بھی یہی ہے۔ آغاز بعثت نبویؐ میں کفار و مشرکین اور عرب قبائل نے توحید کے مشن کو روکنے کے لیے حضرت پیغمبر السلامؐ کو طاقت کے زور سے اور طمع و لالچ دے کر تبلیغ و ترویج حق کے مئوقف سے منحرف کرنے کا جو مذموم منصوبہ بنایا تھا اسے آنحضرتؐ نے استقامت و پامردی کے ساتھ اپنے اخلاق کی قوت و کردار کی عظمت سے جس طرح ناکام بنایا اس کی مثال تاریخ عالم میں کہیں نہیں ملتی۔ اسی سیرت و سنت کو جاری رکھتے ہوئے نواسہ رسولؐ حضرت امام حسین نے یزید کی طرف سے پیش کئے جانے والے مطالبہ بیعت پر یہ موقف اختیار کیا کہ میں کسی طمع و لالچ میں آکر یا خوف و ڈر سے اپنے جد امجد کے مشن کی تکمیل کا عمل ہرگز ترک نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے آخری لمحہ تک اپنے قرآنی' اسلامی و انسانی موقف کی پاسداری کی اور صرف یہی نہیں کہ بیعت سے انکار پر ڈٹے رہے بلکہ اپنے مدمقابل فوج کو بھی اسلامی و انسانی حقوق کی پاسداری اور ظلم و جور سے ہاتھ اٹھا لینے کی تلقین و ہدایت کرتے رہے جو کہ آپ کا منصبی فرض تھا۔ چنانچہ ایک موقع پر آپ نے فوج اشقیاء سے مخاطب ہوکر فرمایا: "ان لم یکن لکم دین ولا تخافون المعاد فکونوا احرارا" فی دنیا کم" (اگر تم کسی دین کے پیروکار نہیں اور نہ ہی قیامت سے ڈرتے ہو تو کم از کم اپنی دنیاوی زندگی ہی میں آزاد مرد بن کر رہو)

حضرت امام حسینؑ نے کربلا کے راستہ میں جو نصیحت آموز اور ہدایت

افروز خطبے ارشاد فرمائے ان سے آپ کے مقدس قیام و جہاد فی سبیل اللہ کی حقیقی بنیادوں سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ نواسہ رسول اس بات سے آگاہ تھے کہ کثیر فوج کے مقابلے میں نہایت مختصر قافلہ مادی طاقت کا بھرپور مظاہرہ نہیں کر سکتا مگر روحانی قوت اور ایمانی جذبہ ایثار و شادت کے ساتھ جس طرح آپ اور آپ کے وفا شعار ساتھیوں نے اپنی جانیں قربان کر کے عزت و حریت کے سائے میں زندہ رہنے کی جو تابندہ مثال قائم کر دی اس کے نتیجہ میں رہتی دنیا تک آنے والی نسلوں کو شرافت' صداقت' استقلال اور اخلاص کے ساتھ انفرادی و معاشرتی اصول و حقوق کی حفاظت و پاسداری کی راہ مل گئی۔ صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی امام حسینؑ کی شہادت سے حاصل ہونے والا پاکیزہ سبق حریت پسند و عزت شعار اقوام کے دلوں میں روح بقا پھونک رہا ہے۔ خواب غفلت میں سوئے ہوئے افراد کو بیداری دے رہا ہے اور صدر اسلام کے ان جواں ہمت سپاہیان توحید کی یاد تازہ کر رہا ہے جنہوں نے مشرکین کی طرف سے اقتصادی بائیکاٹ' معاشرتی قطع تعلقی' قومی تعصّبات' سیاسی دباؤ اور اخلاقی جنگ و اعتقادی تہاجمات کا پوری قوت ایمانی کے ساتھ مقابلہ کیا اور اپنی نہایت قیمتی جانوں کی قربان دے کر کلمہ توحید کی بقا اور پرچم اسلام کی سربلندی کو یقینی بنا دیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب حضرت بلال حبشی کو اذیت و آزار کا نشانہ بنایا جا رہا تھا اور جسمانی طور پر تشدد کیا جا رہا تھا تو ایک مشرک ظالم نے ان سے ازراہ نصیحت کہا کہ اگر تم توحید سے منحرف ہو جاؤ اور محمدؐ کا مشن چھوڑ دو تو ہم تمہیں عزت و آرام کی زندگی دیں گے اور تمہارے دل کی ہر آرزو پوری کر دیں گے تو حضرت بلال نے جواب دیا کہ میں نے اس شخصیت (یعنی حضرت محمد مصطفیٰؐ) کی حقانیت

کی تصدیق کی ہے کہ جس نے تمہاری طرف سے پیش کی جانے والی مادی زندگی کی تمام راحتوں و آسائشوں کے مقابلے میں یہی کہا ہے کہ اگر میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے ہاتھ پر سورج رکھ دیا جائے اور مجھ سے کہا جائے کہ توحید و یکتا پرستی کا مشن چھوڑ دو تو میں ایسی پیشکش کو پاؤں کی ٹھوکر سے مسترد کر دوں گا۔ حضرت بلال کے اس عزم راسخ سے تاریخ اسلام کے عظیم مجاہدوں کی قوت ایمانی و جذبہ ایثار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی قوت و جذبہ کی تکمیل حضرت امام حسینؑ کے جاں نثار و وفا شعار ساتھیوں نے کی اور جب آپؑ نے شب عاشور چراغ گل کر کے اپنے اصحاب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ یزیدی فوج میرے خون کی پیاسی ہے اور انہیں میرے قتل سے غرض ہے لہٰذا تم اس تیرگی شب میں نہایت آزادی کے ساتھ جا سکتے ہو' میں تم پر راضی ہوں۔ اس پر آپ کے ساتھیوں نے اجتماعی طور پر کہا کہ اگر ہمیں بار بار قتل کر کے زندہ کیا جائے۔ اور پھر قتل کیا جائے اور پھر زندہ کیا جائے۔ تب بھی ہم آپ کے پرچم تلے عزت کی موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دیتے ہوئے اپنی جانیں آپ کے قدموں میں نثار کر دیں گے کیوں کہ ہم نے جو راستہ اختیار کیا ہے اسے حق جان کر اختیار کیا ہے اور یہ راستہ پیغمبر اسلامؐ کا راستہ ہے خدا و قرآن کا راستہ ہے اور ہم اس راہ میں اپنی حقیر جانوں کا نذرانہ پیش کرنا دنیا و آخرت کی سعادت و سربلندی سمجھتے ہیں۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے والے اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ حریت شعار اقوام اپنے مسلمہ فطری و انسانی حقوق کے حصول کی جنگ و جدوجہد میں اپنی جانوں سے کھیلنا تو جانتی ہیں مگر اپنے برحق موقف سے انحراف کا تصور ہی نہیں کر

سکتیں۔ حضرت امام حسینؑ نے شب عاشور اپنے ساتھیوں کو آزادی کے ساتھ چلے جانے کی جو بات کی وہ ان کے جذبہ ایمانی کا امتحان لینے کے لیے نہ تھی بلکہ حریت و آزادی کے ساتھ ہر فیصلہ کرنے کا ایک عملی درس تھا تاکہ جذبات و احساسات کی مخصوص فضا میں کسی عمل کی اہمیت کا بھرپور اندازہ ہو سکے اور انسانی اقدار کی پاسداری کا ہر مرحلہ آشکار ہو جائے جو کہ اسلامی تعلیمات کی اصل روح ہے کیوں کہ اسلام حریت و آزادی کا ضامن مکمل آئین حیات ہے اور اس میں کسی قسم کے جبر و اکراہ کی ہرگز کوئی گنجائش نہیں بلکہ اسلام آمریت و استبداد کے خلاف برسرپیکار ہونے کی ترغیب دلاتا ہے۔ قرآن مجید نے متعدد مقامات پر بنی نوع انسان کو فطری قدروں کی پاسداری کا درس دیا ہے اور عقیدہ و عمل میں حریت و آزادی کو بنیادی حیثیت دی ہے۔ انہی پاکیزہ اصولوں کی حکم فرمائی اور فطری و انسانی معیاروں کا احترام ہی شہادت امام حسینؑ کا اصل مقصد تھا۔ امام حسینؑ اس کے سوا کچھ نہ چاہتے تھے کہ جن بنیادی تعلیمات کو حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ہم تک پہنچایا ہے ان پر مکمل عمل کیا جائے اور خود ساختہ اصولوں کی جگہ خدا ساختہ ضوابط کو دی جائے کیونکہ انسان جس قدر عقلمند کیوں نہ ہو لیکن خالق عقل کے فیصلوں اور اس کے بنائے ہوئے آئین کی عمیق گہرائی تک نہیں پہنچ سکتا اور خداوند حکیم و دانا ہے اس کا ہر حکم اس کی عظیم و برتر حکمت پر مبنی اور مخلوق کی خیر و صلاح کا ضامن ہے جب کہ یزید اپنے فسق و فجور اور ارتکاب معاصی کی وجہ سے بے پدر و مادر آزادی کا خواہاں اور عیش و عشرت کی مادی زندگی کو خالق کی بندگی میں عزت کی زندگی پر ترجیح دیتا تھا بلکہ تاریخ کے مستند حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ یزید نے خدا کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال

کرنے کی راہ ہموار کر دی تھی جس پر امام حسینؑ کا خاموش رہنا ممکن نہ تھا لہٰذا آپ نے قیام کیا۔ مدینہ منورہ کو خیرباد کہا جب کہ اس مقدس و نورانی شہر کہ جس کی پاکیزہ گلیوں میں عہد طفولیت و شباب گزارا تھا' کو ترک کرنا آپ کو سخت ناگوار تھا مگر آپ نے اپنے جد امجد کی شریعت کو بقا عطا کرنے کے لیے ایسا کر لیا اور پھر مکہ مکرمہ میں خانہ خدا کہ جو ہر عام و خواص کے لیے پناہ گاہ ہے آپؑ نے اس کی حرمت کو بچانے کے لیے اپنے حج کے احرام کو عمرہ میں بدلا تاکہ یزید بیت اللہ پر حملہ کر کے اس کا تقدس پامال نہ کرنے پائے۔ مکہ مکرمہ سے کوچ کر کے آپ نے صحرا و بیابان سے گزرتے ہوئے کربلا کا رخ کیا۔ دو محرم سے دس محرم تک اس لق و دق صحرا میں رہے۔ بھوک' پیاس اور گرمی کی شدت کو برداشت کیا' عزیزوں' ساتھیوں اور دوستوں کی شہادتیں دیکھیں اور بالآخر اپنے مقدس خون سے شجر اسلام کی آبیاری کی۔ امام حسینؑ شہید ہو گئے مگر توحید کی عظمتوں کو تحفظ مل گیا۔ پرچم اسلام سربلند ہو گیا اور روحانی طاقت مادی قوت پر غالب آ گئی۔ جس کے نتیجے میں آج امام حسینؑ کا مشن زندہ اور آپ کی یاد کا چراغ ہر دل میں روشن ہے جب کہ یزید کا نام داخل دشنام ہو چکا ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے:

بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است
پس بنائے لا الہ گردیدہ است
نقش الا اللہ بر صحرا نوشت
سطر عنوان نجات ما نوشت

محرم الحرام ۱۹۹۹ء

غیر مسلم معاشرہ اور ہماری ذمہ داریاں

یورپ اور مغربی دنیا میں بسنے والے اہل اسلام اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ غیر اسلامی ادیان اور ثقافتوں کے پیروکار اور پروردہ معاشرے میں اخلاقی پستیوں کے جو مظاہر نظر آتے ہیں وہ انسانیت کی پاکیزہ اقدار کی پامالی اور کھلم کھلا بے حرمتی کے سوا کچھ نہیں۔ آزادی کے مقدس نام پر فطرت کے حیات بخش اصولوں کا قتل عام غیر مسلم معاشرے کی پہچان بن چکا ہے۔ جنسی بے راہ روی نے معاشرے کی حرمت کو پاؤں تلے روند ڈالا ہے۔ عورت کی قداست متاع کوچہ و بازار بن کر رہ گئی ہے۔ کردار کی بلندیاں معصیت کی پستیوں میں دب گئی ہیں۔ پاکیزہ انسانوں سے پیار کی جگہ نجس حیوانوں کی محبت نے لے لی ہے۔ احساس کے پراخلاص جذبوں کو سیاست کی ناپاک مصلحتوں کی بھینٹ چڑھا دیا گیا ہے۔ اقتدار کے نشے نے ارباب اختیار کی فکری قوتوں کو مفلوج کر دیا ہے۔ اہل ثروت انسانی عظمت کی خرید و فروخت میں مصروف ہیں۔ صاحبان علم و دانش آفاقی طرز تفکر کو عام کرنے کی بجائے نہایت محدود شخصی و فردی تشخص کو اجاگر کرنے میں منہمک نظر آتے ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ جرائم کے گرم بازار

میں ان کی مجرمانہ خاموشی نے جلتی پر آگ کا کام کیا ہے ------

یہ اور اس کے علاوہ بہت کچھ غیر مسلم معاشرے کو تباہی و بربادی کی طرف دھکیل رہا ہے لیکن یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اس کے ہلاکت آمیز آثار کو جاننے کے باوجود اہل اسلام نہ صرف خاموش ہیں بلکہ ان حالات و روایات کو جذب کرکے انہیں اپنی فردی و معاشرتی زندگی میں اپناتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں اور مغربی تہذیب کے ان تباہ کن آثار کو ترقی کا ضامن قرار دے کر خود ان میں جذب ہو کر رہ گئے ہیں۔ توحید پرست ہونے کے ناطے کیا ہماری کوئی ذمہ داری نہیں؟۔ کفرو شرک کی ثقافت کو ترقی یافتہ تہذیب قرار دینا کون سی دانش مندی ہے! افسوس اس بات پر ہے کہ ہم اپنی اسلامی ذمہ داریاں بھول چکے ہیں اور اپنے اعتقادی تشخص کو کھو چکے ہیں۔ ہم شراب نوشی تو نہیں کرتے مگر شراب فروشی پر غیر مسلموں کے ہاتھوں بیچنے کو بطور جواز ضرور پیش کرتے ہیں' ہم شرعی ذبیحہ کو اہمیت ضرور دیتے ہیں لیکن حرام کی کمائی کو جائز اور حلال ذریعہ معاش میں بدلنے کے لیے کوئی اقدام نہیں کرتے' ہم چادر اور چار دیواری کی باتیں تو بہت کرتے ہیں مگر ان کے تقدس کے لیے عملی قدم نہیں بڑھاتے' ہم جھوٹ بولنے کو گناہ ضرور کہتے ہیں لیکن حکومت کی سماجی و فلاحی اور رفاہی مراعات کے حصول کے لیے سچائی کا دامن چھوڑ دینے کو برا نہیں سمجھتے' ہم رقص و سرور کی محفلیں گرم کرنے پر غیر مسلم معاشرے کو ہدف تنقید ضرور قرار دیتے ہیں لیکن ان کی فراہمی کا کام شعوری و لاشعوری طور پر انجام دینے میں مصروف ہیں' عبادت گاہوں کی تاسیس و تزئین میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں لیکن عبادت کی حقیقی روح سے غافل ہو کر مساجد و معابد میں اپنے تشخص و

امتیاز کے لیے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہونے سے دریغ نہیں کرتے' ہر سال کسی نہ کسی دینی و مذہبی نام پر جلوس نکالنے کی بابت بھرپور اہتمام کرتے ہیں لیکن ان جلوسوں کے روحانی مقاصد کو انہی سڑکوں' گلیوں اور شاہراہوں پر روندتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسلام و ایمان کا دعویٰ ضرور کرتے ہیں لیکن اپنی نجی زندگی میں اس دعوے کی دھجیاں اڑا کر جگ ہنسائی کی راہ ہموار کرتے ہیں' غیر مسلم معاشرے میں رہتے ہوئے ہماری اسلامی تہذیب اسلامی ثقافت اسلامی تمدن اور اسلامی روایات ہمارے لیے قصہ پارینہ بن کر رہ گئی ہیں؟ اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کتابوں کی چار دیواری سے باہر نہیں آتا اور ہم ان تمام حالات میں خوش و خرم' خوشحال اور مطمئن نظر آتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ اس معاشرے میں ہم میں سے ہر فرد اپنے مکتب فکر کا ترجمان ہے اور ہمارا کردار ہمارے دین کی پہچان کرواتا ہے۔

ہم غیر مسلم معاشرے کی خوبیوں کو بھی نظر میں نہیں لاتے' اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ معاشرہ کفر و شرک کی نجاست سے آلودہ ہے اور اس کی خوبیوں کو اس نجاست نے چھپایا بلکہ مٹا کر رکھ دیا ہے لیکن ہم بھی اسی معاشرے ہی کے افراد بن چکے ہیں اور معاشرتی حقوق کے حصول کے لیے اپنی تمام تر توانائیاں بروئے کار لاتے ہیں۔ قانونی جنگ لڑتے ہیں اور اخلاقی و انسانی حوالوں سے اپنے حقوق کے حصول کی جدوجہد کرتے ہیں' یہ سب کچھ درست ہے اور اپنے حقوق کے حصول کے لیے کی جانے والی ہر کوشش بجا ہے تاہم یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اگر ہم معاشرتی حقوق کی خاطر اس قدر سرگرم عمل ہوتے ہیں تو آیا معاشرے کے بھی ہم پر کوئی حقوق ہیں یا نہیں؟ یقیناً" اس کا جواب مثبت ہے' تو

وہ حقوق کیا ہیں اور ہم ان کی ادائیگی کیونکر کر سکتے ہیں تو اس سلسلے میں ہم نے کچھ سوچا ہے؟ یقیناً" اس کا جواب منفی ہے! جب کہ حقیقت امر یہ ہے کہ ہم اپنے دینی تشخص و اقدار سے غافل ہیں' اسلام ایک آفاقی دین ہے' اس میں معاشرے کے تمام شعبوں کی بابت نہایت پاکیزہ اصول موجود ہیں' اس میں بلند پایہ معاشرتی قدریں پائی جاتی ہیں' اس میں مرد اور عورت کو ٹھوس بنیادوں پر حقوق دیئے گئے ہیں۔ عورت کو معاشرے کا ایک لازمی حصہ قرار دیا گیا ہے اور وہ ایک عظیم سوسائٹی کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کر سکتی ہے جب کہ ہم نے اسے معاشرے کا ایک عاطل اور باطل اور بے اثر و غیر موثر عضو قرار دے کر اس کی فطری' انسانی' اخلاقی اور معاشرتی آزادی چھین لی ہے۔ گھر کی چار دیواری میں قید کر کے اس کی صلاحیتوں اور توانائیوں کا خون کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج معاشرہ اخلاقی پستیوں کا شکار ہے کیوں کہ ناانصافیوں بحرانوں کو جنم دیتی ہیں اور بحران تباہیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ حقوق کی جنگ ابدی ہے لہٰذا ہر فرد کو اپنی ذمہ داریوں کے دائرے میں رہ کر کام کرنے کا موقعہ ملنا چاہیے۔

غیر مسلم معاشرہ ہمیں ہمارے دینی اصولوں کے عملی مظاہرے کی دعوت دیتا ہے اور ہمیں ہماری نظریاتی سرحدوں کے تحفظ کے لیے اقدام کرنے کی ترغیب دلاتا ہے۔ اس معاشرے کی اخلاقی قدریں نظرانداز نہیں کی جا سکتیں' ہم اپنی اسلامی ذمہ داریوں کے آئینے میں دیکھیں تو ہمیں وہ سب کچھ نظر آئے گا جو اس معاشرے میں ہمارے کرنے کا اصل کام ہے' معاشرہ افراد کے مجموعے کا نام ہے اس کی شکل و صورت افراد ہی کے کردار سے بنتی ہے اور اس کی بقاء و سلامتی کا راز بھی افراد ہی کی فکری و عملی کاوشوں میں مضمر ہے' معاشرے کی

اقتصادی' سیاسی اور معاشی قوت افراد کے علم' عمل اور عزم و ارادے سے تشکیل پاتی ہے' یہ غیر مسلم معاشرے جہاں متعدد اخلاقی گراوٹوں اور برائیوں کا شکار ہے وہاں اس کے قدرتی حسن اور بعض قابل قدر جمالیاتی پہلوؤں سے چشم پوشی ناممکن ہے' چونکہ اس وقت ہماری بحث اس معاشرے کے جملہ پہلوؤں اور تمام زاویوں سے نہیں اس لیے اس سلسلے میں اظہار خیال سے اجتناب کرتے ہوئے اپنی معاشرتی ذمہ داریوں کی یاد آوری پر اکتفا کرتے ہیں' حقیقت میں کسی معاشرے کا فرد بننے کے لیے اس میں قیام پذیر ہونا کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کے اقتصادی امور میں اپنی صلاحیتیں بروئے کار لانا اور سیاسی مسائل میں اپنا کردار پیش کرنا اور اخلاقیات میں اپنی توانائیوں کے مظاہرے پیش کرنا دراصل معاشرے کا حصہ ہونے کو یقینی بناتا ہے' ہماری عام غلط فہمی یہی ہے کہ ہم گھر بنالینے کو معاشرتی حقوق کا جواز سمجھ لیتے ہیں حالانکہ اس معاشرے کی اہم بلکہ شاید قابل قدر و استفادہ خصوصیت یہ ہے کہ قانون میں بیان کی گئی آزادی اور حقوق کے لیے قومیت و مذہب کی شرطیں نہیں لگائی گئیں جس سے ہم بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں لیکن ایسا کرنا یعنی قانونی حقوق و آزادی سے بھرپور استفادہ کرنا تب ہی درست اور انصاف کے تقاضوں کے مطابق ہوگا جب ہم اپنے دینی اسلامی اور قومی و ملی تشخص کو عملی طور پر ثابت کرنے میں کامیاب ہو سکیں اور موجودہ ترقی یافتہ دور کے تقاضوں کو خاطر میں لاتے ہوئے کچھ کر سکیں۔ ہمارے اہل علم و دانش اور ارباب فکر و نظر اسلام کے مکمل ضابطہ حیات ہونے کا جس واضح اور ٹھوس انداز میں اظہار کرتے ہیں وہ اس غیر مسلم معاشرہ پر تب صحیح ثابت ہو سکتا ہے جب اس معاشرے کی گلیوں اور کوچوں میں ہمارے قدموں کی آہٹ سے

بھی ہمارا تشخص نمایاں ہو' ہماری سوچ ہمارے باطن کا اور ہمارا باطن ہمارے تشخص کا ترجمان اور ضامن ہے' ہماری ذمہ داری ننھے معصوم بچوں کو مقدس کتاب قرآن مجید کے الفاظ یاد کرا دینے تک محدود نہیں بلکہ ان کی فکری تربیت بھی ہماری بنیادی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری جوان اور نوجوان نسل اپنی عبادت گاہوں کو اسی قدر مقدس سمجھتی ہے کہ وہاں جاکر آنکھیں بند کرکے رحل کے سامنے بیٹھا جائے اور قرآن کے عربی الفاظ رٹ کر گھر واپس آیا جائے جب کہ ان الفاظ کے معانی و مفاہیم اور آفاقی پیغام و حیاتی پروگرام سے کوئی سروکار نہیں۔ اگر ہم اپنی ان رسمی عبادتوں کے حقیقی مقاصد سے دور رہے تو یقیناً" ہماری آئندہ نسلیں اپنی عبادت گاہوں سے وہی برتاؤں کریں گی جو آج کلیساؤں کے داتا اپنی عبادت گاہوں سے کر رہے ہیں اور انہیں فروخت کرنے کے فیصلوں تک جا پہنچے ہیں' آج ہمیں اپنی قومی و دینی ذمہ داریوں کی تکمیل اپنی آنے والی نسلوں اور اس معاشرے میں بسنے والی قوموں پر اپنا تشخص ثابت کرنے کے لیے دعوت فکر و عمل دیتی ہے اور ہماری عظیم ثقافت ہمارے کردار کو مثبت راہوں پر لانے کے لیے ہمیں صدا دے رہی ہے اور ہماری معاشرتی ذمہ داریاں ہمیں ہمارے معاشرتی حقوق کے حصول کے لیے ہر ممکن اقدام کرنے کی طرف بلا رہی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم وقت کی آواز پر لبیک کہنے میں دیر کر دیں اور پھر وقت ہمارا ساتھ چھوڑ دے۔

جنوری ۱۹۹۶ء

سیرت نبویؐ : کردار سازی کا بلند معیار

یوں تو دنیا میں ہر شخص اپنے کردار و اخلاق کی بلندی چاہتا ہے لیکن کوئی اخلاق اس وقت تک مدارج کمال کو نہیں پا سکتا جب تک اس کی تکوینی بنیادیں کسی بلند معیار پر استوار نہ ہوں۔ افراد بشر کے اختلاف طبائع کے پیش نظر خدائے قدوس نے قرآن مجید میں اعلیٰ سیرت و کردار کے حصول کے لیے ایک واضح و کامل معیار کی نشاندہی فرمائی ہے۔ ارشاد حق تعالیٰ ہے: ”تمہارے لیے رسول خداؐ کی زندگی کردار سازی کا بہترین نمونہ اور کسب کمالات کا اعلیٰ معیار ہے۔“

حضرت پیغمبر اسلامؐ کی زندگی کا ہر پہلو لائق تقلید ہے۔ ولادت باسعادت سے لے کر زندگی کے آخری لمحات تک آپؐ کا حسن اخلاق بلندی کردار اور اخلاص عمل کا معیار رضائے الٰہی کے حصول کے سوا کچھ نہ تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ جس زمانے میں آپؐ نے اس مادی دنیا میں قدم رکھا' وہ تاریخ بشریت کا بھیانک ترین دور تھا' لوگ ایک خدا کی بجائے کئی خداؤں کی پرستش کرتے تھے اور اس خدا کو چھوڑ کر جس نے انہیں پیدا کیا' ایسے خداؤں کی پوجا

کرتے تھے جنہیں خود انہی لوگوں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا' پتھر' لکڑی' لوہا اور مٹی وغیرہ سے بنائے ہوئے بتوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ان لوگوں کا شیوہ ہی نہیں بلکہ طرہ امتیاز و افتخار بن چکا تھا۔ ایسے عالم میں حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ظہور فرمایا اور بت پرست لوگوں کو خدا پرستی کی دعوت دی۔ ابتداء میں اس قسم کی دعوت کا تصور ہی ان کے لیے ناممکن تھا چنانچہ ہر طرف سے مخالفت کی تند و تیز ہوائیں چل پڑیں۔ آپؐ کو قتل کی دھمکیاں ملنے لگی' دنیاوی عیش و عشرت کا لالچ بھی دیا گیا' ظاہری مادی حکومت و اقتدار کی پیشکش ہوئی اقتصادی بائیکاٹ کی ناکامی کی صورت میں طاقت کے زور پر آپ کی دعوت حق کو دبانے کی کوششیں کی گئیں مگر حضرت پیغمبر اسلامؐ چونکہ ایک عظیم ذمہ داری لے کر آئے تھے اور قیامت تک آنے والی نسلوں کی کردار سازی کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانا مقصود تھا لہٰذا آپؐ نے نہ تو کسی دھمکی کی پرواہ کی اور نہ ہی کسی مادی لالچ میں آکر توحید پرستی کے برحق نظریہ میں کوئی لچک پیدا ہونے دی بلکہ روز بروز اپنی حکمت عملی کے ذریعے اپنے مقصد کی تکمیل کو نزدیک سے نزدیک تر کرتے چلے گئے چنانچہ معتبر کتب تواریخ اس حقیقت کی گواہی دیتی ہیں کہ جب مکہ کے سرداروں نے حضرتؐ کے چچا جناب ابوطالب کے ذریعے پیغام بھجوایا کہ محمدؐ سے کہیں کہ اگر ان کی خواہش مال و زر کی ہو تو ہم لاکھوں درہم و دینار فوراً جمع کرکے ان کے حوالہ کر دیتے ہیں اور گر ریاست' اقتدار و سرداری کی طلب ہو تو سارا قریش انہیں اپنا سردار ماننے کو تیار ہے اور اگر عورت کی تمنا ہو تو جس قدر ہاشمی' غیر ہاشمی' قریشی یا غیر قریشی خوبصورت لڑکیاں اپنے عقد میں لانا چاہیں تو یہ بات بھی ہمیں منظور ہے۔ ہم ان کی نظر انتخاب پر عمل کریں گے' جب یہ پیغام

آپ ؐ کو ملا تو آپ ؐ نے جواب میں یوں ارشاد فرمایا:

اے چچا جان! ان سے کہہ دیجئے کہ محمد ؐ دنیا کی آرائش و آسائش و زیبائش اور زر و زینت کو اپنی دعوت حق کے مقابلے میں ہیچ سمجھتا ہے اگر میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند رکھ دیا جائے تو میں پوری کائنات کو تو چھوڑ سکتا ہوں مگر اپنے خدائے واحد خالق برحق کی وحدانیت کی تبلیغ سے منہ نہیں موڑ سکتا۔

اپنے اس بیان میں آنحضرت ؐ نے استقامت و استقلال اور پامردی کی ایسی مثال قائم کی کہ دنیا کی زیب و زینت اور طمطراق کو ایک ہی جملہ میں ٹھوکر مار دی اور حق و حقیقت کے مقابلے میں سرداروں اور سرمایہ داروں کی طمع و لالچ کو ہرگز کوئی اہمیت نہ دی۔ یہ بات آپ ؐ کی سیرت طیبہ کا روشن ترین پہلو ہے کہ حق کے مقابلے میں کسی بڑی سے بڑی طاقت کو بھی اہمیت نہ دیتے تھے بلکہ ہر بات اور ہر معاملے میں آپ ؐ کا معیار حق و صداقت کے سوا کچھ نہ تھا۔

ایک دفعہ حضرت علی نے آپ ؐ سے دریافت کیا یا رسول اللہ ؐ ! آپ کا اسوۂ حسنہ کیا ہے؟ اور اس کی اہم بنیادیں کیا ہیں؟

☆ حضور ؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا: معرفت خدا میرا راس المال (اصل سرمایہ) ہے۔

☆ عقل میرے دین و اعتقاد کی بنیاد ہے۔

☆ محبت میری زندگی کی اساس ہے۔

☆ شوق الٰہی میرا مرکب (سواری) ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ کا ذکر میرا مونس ہے۔

وقار و وثوق میرا خزانہ ہے۔

☆ آخرت کا احساس میرا ساتھی ہے۔

☆ علم میرا ہتھیار ہے۔

☆ صبر میری ردا ہے۔

☆ خدا کے ہر فیصلے پر راضی رہنا میرا مال غنیمت ہے۔

☆ عاجزی میرا طرہ افتخار ہے۔

☆ زہد و تقوی میرا پیشہ و روش ہے۔

☆ یقین میری قوت ہے۔

☆ سچائی میری شفاعت کی دلیل ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میرا حسب و نسب ہے۔

☆ جہاد میرا خلق و عادت ہے۔

☆ نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

☆ میرے دل کا سکون ذکر الٰہی ہے۔

☆ میں اپنی امت کا درد مند ہوں (اپنی امت کے لیے ہمیشہ فکر کرتا ہوں اور اس کی نجات و سعادت کا خواہاں رہتا ہوں) اور اپنے رب کے حضور شرفیاب ہونے کے اشتیاق میں زندگی بسر کر رہا ہوں۔

حضرت پیغمبر اسلامؐ نے اپنے ان حکیمانہ کلمات میں کردار سازی کے دو بنیادی اصول بیان فرمائے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک مستقل طور پر ایک ضابطہ حیات کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر اصول اپنے دائرہ ادراک میں کردار سازی کا مکمل دستور ہے۔ سعادت و کامرانی عطا کرنے والے زرین اصول نبی کریمؐ کا

سرمایہ حیات تھے۔ ان میں سے صرف ایک نہیں بلکہ سب ہی آپ ؐ کی زندگی کا معمول اور حیات طیبہ کے انفرادی و اجتماعی پہلوؤں میں اوڑھنا بچھونا بن چکے تھے۔

بے شک آپ ؐ کی زندگی کا اصل سرمایہ معرفت پروردگار کے سوا کچھ بھی نہ تھا اور یہی بات دیگر افراد بشر کے لیے ضروری ہے کہ ان کا سرمایہ حیات یہ ہونا چاہیے کہ وہ صحیح طور پر اپنے خالق کی معرفت حاصل کریں اور جب کوئی فرد اپنے پروردگار کی معرفت حاصل کرلے تو پھر اس کی زندگی کا ہر پہلو عرفان الٰہی کے سانچے میں ڈھلتا ہوا نظر آئے گا اور کوئی بیرونی طاقت اس کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہیں کر سکتی' یہ وہ حقیقت ہے کہ جس کی عملی تصویر حضرت پیغمبر اسلام ؐ نے اپنے زمانہ کے لوگوں کے سامنے پیش کر دی۔ چنانچہ اس دور کی بڑی سے بڑی طاقت بھی آپ ؐ کی سیرت و کردار کی مضبوط بنیادوں کو متزلزل نہ کر سکی اور آپ ؐ ہمیشہ یہی فرمایا کرتے تھے کہ جب میں نے اپنے خالق حقیقی کو پہچان لیا ہے تو پھر کسی مشکوک خدا یا خلق خدا کے سامنے کیونکر جھک سکتا ہوں کیونکہ جس کی بارگاہ میں اظہار بندگی کا فریضہ ادا کرنا ہے' وہ ایسا ہونا چاہیے جو ہر شے پر قادر ہو اور پوری کائنات اس کی محتاج ہو ورنہ وہ اس لائق ہی نہیں کہ اشرف المخلوقات انسان اس کی دہلیز پر پیشانی رگڑتا رہے یہی وجہ ہے کہ آپ ؐ نے اپنے دین کی بنیاد عقل کو قرار دیا' عقل ہی کے ذریعے ہر فرد حق و باطل اور سچ اور جھوٹ میں تمیز کر سکتا ہے۔

اپنی سیرت طیبہ کے ایک مضبوط پہلو کو واضح کرتے ہوئے آپ ؐ نے محبت کو اپنی زندگی کی اساس قرار دیا گویا حق و حقیقت سے محبت کرنا معراج

انسانیت ہے اور کمال فطرت سے محبت کرنا ابدی سعادت کے حصول کا ذریعہ ہے۔

آپ ؐ کو معاشرے کے غریب و نادار، بے کس و بے بس افراد سے گہری محبت تھی، ان کی دیکھ بھال اور حاجت روائی آپ ؐ کا شیوہ تھا، دن بھر معمولات زندگی کے امور سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ رات کی تاریکی میں شہر کے مفلس و نادار لوگوں کو ضروریات زندگی مہیا کرنا آپ ؐ کا روز مرہ کا معمول تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر نادار افراد اس وقت متوجہ ہوئے، جب آپ ؐ اس دار فانی سے رحلت فرما گئے کہ رات کی سیاہی میں ان کی حاجت روائی کرنے والا عظیم انسان محمد مصطفیٰ ؐ تھا، سادہ لباس اور سادہ گفتار کے ذریعے آپ ؐ نے اپنی مقدس زندگی کے کردار ساز پہلوؤں کو نمایاں کیا، لقائے پروردگار کے حقیقی عشق کے سہارے آپ ؐ نے زندگی کا سفر طے کیا، آپ ؐ نے دنیاوی زندگی کو ابدی حیات کا ذریعہ و وسیلہ بنایا تاکہ فانی دنیا کی عیش و عشرت ابدی جہان کی روحانی لذتوں کے حصول میں رکاوٹ نہ بننے پائے بلکہ اس تک پہنچنے کے لیے ایک مرکب و سواری کا کام دے، آپ ؐ نے ہمیشہ اپنے سفر حیات میں ذکر کردگار کو دنیا کی وحشت و اجنبیت کے مقابلے میں اپنے لیے مونس پایا کیوں کہ آپ ؐ اس حقیقت کا مکمل عرفان رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر ہی سے دلوں کو سکون و اطمینان نصیب ہوتا ہے (الا بذکراللہ تطمئن القلوب) اسی وجہ سے پیغمبر اسلام ؐ اپنی ساری زندگی قلبی سکون و اطمینان اور قرار و استقرار کے ساتھ کاروبار زندگی چلاتے رہے اور اسی سکون و وثوق یعنی خود اعتمادی و خدا پرستی کو اپنی زندگی کا سرمایہ اور ہمیشہ باقی رہنے والا خزانہ قرار دیا جس کی وجہ سے مادی ثروت کے

فقدان نے آپ ؐ کے وثوق نفس و اطمینان قلب کو متاثر نہ کیا بلکہ خود اعتمادی کی تقویت کا باعث بنا کیوں کہ آپ ؐ کی پاکیزہ زندگی کا مقدس احساس یہی تھا کہ دنیا فنا پذیر اور آخرت میں ابدی بقا ہے۔ اسی احساس کے ساتھ آپ ؐ کی حیات طیبہ امتیازی حیثیت کا حامل رہی۔

آپ ؐ جس دور میں ظہور پذیر ہوئے وہ تاریخ بشریت کا تاریک اور جہالت سے پر زمانہ تھا۔ لہٰذا آپ ؐ نے جہالت و جاہلیت کا مقابلہ کرنے کے لیے علم و آگاہی کو مضبوط ترین ہتھیار کے طور پر استعمال کیا یہاں تک کہ اپنی امت کے لیے حصول علم کی اہمیت واضح کرتے ہوئے تحصیل علم کو فرض و فریضہ قرار دیا'

اس کے علاوہ سیرت نبوی ؐ کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ حوادث زمانہ اور نابسا مانی روزگار کے مقابلے میں صبر و یکیسائی اختیار کرنا کردار سازی کا بہترین ذریعہ ہے۔ آپ ؐ نے ابتلائے زمانہ کے روبرو استقامت و تحمل کا مظاہرہ کرکے ایک مثال قائم کردی۔ ہر مصیبت پر صبر کرنا آپ ؐ کی پاکیزہ سیرت کا درخشندہ پہلو ہے چنانچہ صبر کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے آپ ؐ نے فرمایا کہ "صبر میری ردا ہے" صبر کے ساتھ ساتھ سیرت و کردار کا مضبوط پہلو یہ بھی تھا کہ آپ ؐ کی زبان اقدس پر ذکر الٰہی کا فکر انگیز ورد ہمیشہ جاری رہتا تھا اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں (قضا و قدر) پر اظہار رضایت فرمایا کرتے تھے' آپ ؐ نے خدا کی رضا پر راضی رہنے کو اپنے لیے مال غنیمت کی مانند قرار دیتے ہوئے اس امر کی نشاندہی فرمائی کہ کائنات کا ہر فیصلہ درحقیقت خود انسان ہی کے لیے صلاح و فلاح کا ضامن ہوتا ہے اس لیے اس پر راضی رہنا عظمت انسانی کی معراج ہے' جب کہ تمرد و

سرکشی سے فطری عظمتیں پامال ہو جاتی ہیں' ہر شخص کو کردار کی بلندی کے لیے ایسے معیار کو اپنانا چاہیے جو اس کی حقیقی اقدار کا ضامن ہو اگر انسان معاشرتی طور پر رضائے کردگار کے سامنے شیطانی وسوسوں کی زد میں آکر اپنی انسانی و فطری عظمت کو پامال کر دے تو نہ صرف یہ کہ وہ معاشرتی طور پر عدم اطمینان کا شکار ہو گا بلکہ اسے اپنی انفرادی زندگی میں بھی اضطراب و نابسامانی سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور انسان چونکہ سماجی زندگی کے حلقے میں گھرا ہوا ہے لہٰذا اسے سماج پسندی کے لیے خدا پرستی کو معیار عمل قرار دینا ضروری ہے اور اسی امر کے لیے اس کا فطری اخلاق اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ اپنے قومی و عظیم کردگار کے حضور عجز و انکساری کو اپنائے' حضرت نبی کریم ؐ نے ہمیشہ اسی امر کو مورد توجہ قرار دیا اور اسے کردار کی بلندی کے لیے طرہ افتخار قرار دیا کیوں کہ جب اہل دنیا غیر معیاری اصولوں کے سہارے اپنے ہمنوع افراد کے سامنے اظہار عجز کرتے ہیں تو بلند کردار کے مالک افراد اپنے اعلیٰ معیار عمل کے مطابق اپنے خالق کے حضور عاجزی کرنے کو اپنے لیے فخر سمجھتے ہیں کیوں کہ زہد و تقوی کو اپنا پیشہ و روش قرار دیتے ہوئے حقیقت پسندی و حق شناسی پر یقین سے قوت ملتی ہے ارباب حق کی قوت ہی زہد و تقوی یعنی مادی دنیا سے بے نیازی اور ہر امر مین نفسانی خواہش کے غلبے سے محفوظ رہنے میں ہے جو کہ ایک نمونہ آشکار ہے سیرت نبوی ؐ کا اور جب یہ سب کچھ ہو جائے تو پھر زبان صدق و صفا کو اپنا شعار بنا لیتی ہے جس کے سبب انسان کی شفاعت کی ضمانت فراہم ہو جاتی ہے۔

سیرت نبوی ؐ میں ایک اور امتیازی پہلو یہ ہے کہ آپ ؐ نے دنیا کے روابط کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو اپنا حسب و نسب قرار دیا جس سے

ثابت ہوتا ہے کہ خدا کی اطاعت کردار سازی کا اہم ترین پہلو ہے جب قلب انسان اپنے خالق کی فرمانبرداری سے متصف ہو جائے تو خدا اسے کائنات کی احتیاج سے بے نیاز کر دیتا ہے اور اطاعت الٰہی کا پہلا مرحلہ یہی ہے کہ دل مطمئن ہو اور جب یہ مرحلہ طے ہو جائے تو سیرت نبوی ؐ کے آئینے میں کردار سازی کا راستہ کھل جاتا ہے اور جہاد کی منزل آجاتی ہے۔ جہاد یعنی حقائق امور کے ادراک کی کوشش، جہاد یعنی فطری عظمتوں کی پاسداری کی کوشش، جہاد یعنی حقیقت پروردگار کی معرفت کے حصول کی کوشش، اور یہ کوشش بھی سیرت نبوی ؐ کا درخشندہ پہلو ہے۔

آپ ؐ نے اپنی سیرت طیبہ اور اسوہ حسنہ کی تجلی کا ایک نمونہ پیش کرتے ہوئے نماز یعنی بارگاہ الٰہی میں راز و نیاز کرنے کو اپنی بصیرت شعار نگاہ کی ٹھنڈک قرار دیا چونکہ نماز میں ذکر الٰہی کا فطری حسن ہوتا ہے اس لیے آپ ؐ نے فرمایا کہ یہ ذکر میرے دل کا سکون ہے۔

ان تمام خصائل کے باوجود سیرت نبوی ؐ کا تکاملی پہلو معاشرتی احساس ذمہ داری ہی ٹھہرا اور آپ ؐ نے اپنی امت کی درد مندی کو اپنے اسوہ حسنہ کا اہم حصہ قرار دیا کیوں کہ اس سے معاشرتی روابط میں ہمنوع افراد کے حقوق کی پاسداری کا احساس پوشیدہ ہے اور یہی لائق تقلید ہے کہ انسان سیرت نبوی ؐ کی روشنی میں ہر لمحہ اپنے خالق کے حضور شرفیاب ہونے کا مشتاق رہے اور جب یہ امور درجہ کمال کو پہنچ جائیں تو خود سازی و کردار سازی آسان ہو جاتی ہے۔

جنوری ۱۹۸۵ء

قرآن

جامع دستور حیات

(ماہ رمضان المبارک میں نزول قرآن کی مناسبت سے خصوصی تحریر)

قرآن مجید کئی اعتبار سے تقدس اور عظمت کا حامل ہے۔ ایک تو یہ کہ اسے خالق کائنات کے الہامی کلام ہونے کا شرف حاصل ہے جو اس کی بنیادی حقیقت اور حقیقی بنیاد ہے اور اسی وجہ سے اس کا شمار آسمانی کتب میں ہوتا ہے۔

اور دوسرا یہ کہ قرآن اس عظیم المرتب ذات کی صداقت و حقانیت کو ثابت کرنے والا ابدی معجزہ ہے جسے عالمین کے لیے "رحمت" بنا کے بھیجا گیا یعنی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ------ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

"وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰالَمِيْنَ" ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر عالمین کے لیے رحمت بنا کر

وہ آخری نبی جسے تمام انبیاء کا سردار، تمام رسولوں سے افضل اور قیامت تک آنے والی نسلوں کے لیے ہادی و رہبر بنایا گیا اس کے حیات بخش نظام حیات کی سعادت آفرین کتاب قرآن ہے۔

قرآن وہ کتاب ہدایت ہے جس میں انسانی معاشرے کی صلاح و فلاح اور کامیابی و کامرانی کے حصول کے زریں اصول بیان کئے گئے ہیں۔

قرآن مجید کو جہاں ابدی مقام حاصل ہے وہاں اس کی آفاقیت بھی مسلم ہے، گویا یوں کہا جا سکتا ہے کہ جب تک زمانہ باقی ہے قرآن کی سعادت آفرین تاثیر بھی باقی ہے۔ نہ ہی گردش لیل و نہار اس کی اعجاز آمیز حقیقت کو بدل سکتی ہے اور نہ ہی امتداد روزگار اس کے انسان ساز معانی و مفاہیم کی تازگی پر اثر انداز ہو کر اس کے الہامی حسن کے حقیقی پہلوؤں کو مجاز کا رنگ دے سکتا ہے لہٰذا یہ کہنا بے جا اور مبالغہ پر مبنی نہ ہو گا کہ قرآن اس وقت تک زندہ و جاوداں ہے جب تک دنیا باقی ہے اور یہی بات اس کی ابدیت کی دلیل ہے۔

قرآن مجید کی آفاقی حیثیت سے کوئی صاحب عقل و خرد انکار نہیں کر سکتا اس لیے کہ یہ مقدس کتاب جس عالمگیر شخصیت کا معجزہ ہے انہیں کسی خاص قبیلے، گروہ یا نسل کی ہدایت و رہبری کے لیے نہیں بھیجا گیا بلکہ انہیں دنیائے بشریت کے تمام افراد کو فطرت کی پاکیزہ حقیقتوں سے آشنا کرنے اور انہیں سعادت و عظمت کی نورانی منزل تک پہنچانے کے لیے مبعوث کیا گیا ہے چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ جب پیغمبر اسلامؐ مبعوث ہوئے تو اس وقت ظلم و بربریت کے سیاہ بادل انسانی معاشرے پر چھائے ہوئے تھے۔ نسلی امتیازات کے حصول کے لیے متعدد قومیں آپس میں نبرد آزما تھیں، توحید کی بجائے شرک و تثلیث کے نظریات کے ساتھ ساتھ کفر و الحاد اور بت پرستی و بت سازی کا دور دورہ تھا، انسان انسان کا دشمن ہی نہیں بلکہ انسانی اقدار کا قاتل بن چکا تھا، ستم ظریفی کا یہ عالم تھا کہ انسانوں کے قتل عام کو "شجاعت و بہادری" کا نام دیا جاتا تھا، کچھ لوگ اپنے ہی کمزور و ناتوان ہاتھوں سے تراشے ہوئے

لکڑی اور پتھر کے بے جان و بے اختیار مجسّموں کے آگے سر تسلیم و تعظیم خم کر کے انسانیت کی عظمتوں کو پامال کر رہے تھے اور کچھ لوگ وہ تھے جو خود ساختہ حکمرانوں کی بندگی کا طوق گلے میں ڈال کر فطرت کے تقدس کو مجروح کرنے میں مصروف تھے۔ جہالت ہی جہالت پورے انسانی معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ اس دور کو "دور جاہلیت" کے نفرت آمیز نام سے یاد کرتی ہے کیوں کہ اس دور میں تہذیب و تمدن کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ادب و اخلاق کا تصور تک ختم ہو چکا تھا' زشتی کو زیبائی اور پستی کو بلندی کا نام دیا جا رہا تھا۔ انسانی معاشرے میں عزت و احترام کا معیار روحانی اقدار کی بجائے مادی قوت تھی' انسانوں کی خرید و فروخت کا کاروبار اپنے عروج پر تھا اور صنف نازک کو معاشرے کے پست و حقیر ترین افراد میں شمار کیا جاتا تھا۔ تو ایسے حالات میں کردگار عالم نے منجی عالم بشریت محسن دنیائے انسانیت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو بھیجا تاکہ وہ خدائے قدوس کا پیغام ہدایت گمراہ لوگوں تک پہنچائیں اور انہیں غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرا کے حریت و استقلال کی راہ پر گامزن کریں۔

چنانچہ اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے قرآن جیسی عظیم کتاب "معجزہ" کے طور پر حضرت محمد ﷺ کو عطا کی گئی تاکہ آپ ؐ قرآن مجید کے حیات آفریں اصولوں کی روشنی میں ضلالت و گمراہی میں ڈوبے ہوئے معاشرے کو ہدایت و سعادت کی ابدیت نواز منزل تک پہنچا سکیں۔

قرآن مجید نے اپنی الہامی تاثیر کے سبب عرب کی فصاحت و بلاغت کی مجازی قوت کو اپنی پاکیزہ آیات کی حقیقی طاقت کے ذریعے مغلوب کر دیا اور دنیائے عرب کے شعراء و دانشور اپنی وسیع و مضبوط ترین ادبی قوت کے باوجود قرآن کی نظیر

پیش کرنے سے عاجز ہو گئے۔ قرآن نے ان لوگوں کو چیلنج کرکے اپنی ایک "سورت" کے مقابلے میں کچھ پیش کرنے کے لیے کہا۔ چنانچہ ارشاد ہوا: وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآئَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِیْنَ ------" (اور اگر تم اس کی بابت شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے (قرآن) تو اس جیسی ایک سورت پیش کرو اور اللہ کے سوا اپنے مددگاروں کو بھی بلالو' اگر تم سچے ہو) (سورہ بقرہ' ۲۴)۔

خداوند عالم نے واضح الفاظ میں چیلنج کرکے عرب کے نامور اور مغرور ادیبوں کو لاجواب و شرمندہ کر دیا اور وہ قرآن کی ایک سورت کی نظیر بھی پیش کرنے سے عاجز رہے۔

قرآن مجید کی مثل و نظیر لانے کی یوں تو بہت کوشش کی گئیں اور تمام ادبی و علمی توانائیاں بروئے کار لاکر قرآنی چیلنج کا جواب دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی مگر وہی ہوا جو خدا نے فرمایا: "فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوْا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اعدت للکافرین"

(پس اگر تم ایسا نہیں کر سکے اور نہ ہرگز کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں جو کافروں کے لیے مقرر کی گئی ہے) کوئی شخص قرآن جیسا فصیح و بلیغ اور جامع کلا پیش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

قرآن مجید صرف فصاحت و بلاغت ہی میں بے نظیر نہیں بلکہ اپنی جامعیت و ہمہ گیری میں بھی اپنی مثال آپ ہے (وَكُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْ كِتَابٍ مُّبِیْنٍ) خدا نے فرمایا: ہم نے ہر چیز کتاب مبین میں ذکر کر دی ہے۔

اس مقدس کتاب الٰہی میں بنی نوع آدم کی دنیاوی و اخروی زندگی کے جملہ

پہلوؤں کی بابت سعادت بخش اصول مذکور ہیں اور قرآن مجید اپنی تمام تر فصاحت و بلاغت کے باوجود اپنے معانی ومفاہیم اور حقائق کی تفہیم میں ایسے خوبصورت و آسان انداز سخن کا حامل ہے کہ اسے پڑھنے والا ہر انسان اپنے معیار علم و فکر کے مطابق اس سے ہدایت کی روشنی پا سکتا ہے اور یہ صرف اس لیے ہے کہ اس کے نازل کرنے کا اصل مقصد یعنی ہدایت خلق پورا ہو جائے اور کوئی شخص صرف اس کو سمجھنے سے قاصر ہونے کی وجہ اس کی نعمت ہدایت سے محروم نہ رہے۔

قرآن مجید میں مختلف انداز ہائے سخن کے ذریعے اور گوناگوں تذکروں کے ضمن میں عالم انسانیت کو دشمنان فطرت کی شیطانی چالوں سے باخبر کرکے ایسی پاکیزہ و نورانی راہیں دکھادی گئی ہیں جن پر چل کر فطرت سلیمہ کی مقدس اقدار کی پاسداری کو یقینی بنایا جا سکتا ہے اس لیے اس میں انفرادی و معاشرتی تمام امور کی بابت قرآن سے تمسک کے طریقہ کار کو بھی ذکر کر دیا گیا ہے تاکہ اس پاکیزہ کلام کی روشنی سے عالم انسانیت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اجالا ہو جائے۔

انسانی معاشرے کی بنیادی ضرورت

انسانی معاشرے میں سب سے اہم مسئلہ اس نظام کا ہوتا ہے جس کے سائے میں معاشرے کے افراد اپنا کاروبار زندگی چلاتے ہیں اور جو قوانین معاشرے پر حکم فرما ہوتے ہیں درحقیقت انہی کی روشنی میں لوگوں کی تقدیر بنتی اور بگڑتی ہے۔ اگر قانون سعادت بخش ہو تو یقیناً" معاشرہ بھی سعادت مند ہو سکتا ہے اور اگر قانون و نظام ہی میں کمزوری ہو تو معاشرہ بھی اسی طرح کمزور اور بدبخت ہوتا ہے۔

قرآن مجید نے ایک آئیڈیل انسانی معاشرے کی تشکیل کے لیے مختلف زاویوں سے بحث کی ہے۔ سب سے پہلے قرآن مجید نے معاشرے کے نظام اور اس کے حقیقی محور کے تعین پر زور دیا ہے اور اس امر کو سب سے زیادہ اہمیت کی نگاہ سے دیکھا ہے کہ انسانی معاشرے پر جو نظام حاکم ہو' اس کا مرکزی نقطہ کون سا ہوگا؟ ------- آیا وہ کائنات جس کی تخلیق کا کام خداوند عالم نے انجام دیا ہے۔ اس حکمران اصولوں کی ذمہ داری کے لیے کوئی پروگرام بنایا ہے یا نہیں؟۔ آیا وہ انسان جسے خداوند عالم نے تمام مخلوقات سے افضل و بہتر پیدا کیا' اس کی زندگی کے نظام کو اپنے علاوہ کسی دوسرے کے سپرد کر دیا ----؟ یا پھر یہ کہ انسان کو اپنی تقدیر کا فیصلہ کرنے کا پورا پورا اختیار دے کر تمام قوانین کی تدوین و ترتیب کا حق اسے سونپ دیا اور خود --------- نعوذباللہ --------- ایک خاموش تماشائی بن کر رہ گیا--------؟۔

قرآنی آیات کا مطالعہ کرنے اور ان میں تدبر کرنے سے ان تمام باتوں کے جوابات واضح طور پر معلوم ہو جاتے ہیں جنہیں بطور خلاصہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ:

خداوند عالم نے اپنی عنایت خاصہ کے ساتھ جس طرح انسانوں کو پیدا کیا' اسی طرح ان کے نظام حیات کی ذمہ داری بھی اپنے اوپر رکھی اور ان کے درمیان حکمران اصولوں کا تعین بھی خود ہی کیا' البتہ نظام پر عمل کرنے اور اس کے احکامات کی مکمل پابندی کرنے کا تاکیدی حکم صادر فرمایا تاکہ انسان ان پر عمل پیرا ہو کر اپنی سعادت کی منزل تک پہنچ جائے' تاہم اسے مجبور نہیں بنایا بلکہ اسے مکمل اختیار دے کر ہدایت و ضلالت' سعادت و شقاوت' عزت و ذلت اور نجات

وہلاکت کے تمام راستے بتا دیئے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:۔

"وَھَدَیۡنٰہُ النَّجۡدَیۡنِ" یعنی ہم نے انسان کو دونوں راستے دکھا دیئے۔

انسانوں کے باہمی روابط اور معاشرتی اصولوں کے متعلق قرآن مجید نے ایک واضح اور بنیادی اصول وضع فرمایا ہے' چنانچہ ارشاد ہوا:۔

"اِنَّا خَلَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ وَّ اُنۡثٰی وَ جَعَلۡنٰکُمۡ شُعُوۡبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوۡا اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ

"یعنی ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہیں شعبوں اور قبیلوں کی صورت میں بنا دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو' یقیناً" تم میں عزت و احترام کا حقدار وہ ہو گا جو تم میں سے زیادہ متقی و پرہیزگار ہو۔

اسی طرح خداوند عالم نے معاشرے کے حکمران اصولوں کا مرکزی نقطہ اور حقیقی محور بھی خود اپنی ذات کو قرار دیا' چنانچہ ارشاد فرمایا:۔

"اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ" یعنی حکم صرف خدا کے لیے ہے' اس کا اپنا حق ہے جو حکم نافذ کرے اس کے لیے زیبا ہے اور یہ اسی کا کام ہے کہ معاشرے کے اخلاقی' اجتماعی' اقتصادی' اعتقادی' سیاسی و سماجی اصولوں کو وضع کرے اور ایک صحیح' سعادت مند' خوشحال' کامیاب اور آئیڈیل انسانی معاشرے کی سرپرستی اور نگرانی کرے۔

انسانی معاشرے کی فلاح و صلاح کے لیے قرآن مجید نے مفید' مؤثر اور آسان طریقے بتائے ہیں جن کی روشنی میں معاشرے کے افراد کے درمیان بنیادی روابط اور ان کے صحیح طرز عمل کی مکمل وضاحت کی گئی ہے۔

قرآن مجید میں انسانوں کی مادی و معنوی ضرورتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسے

کردار ساز اصول اور سعادت بخش قوانین مرتب و مدون کئے گئے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر دنیا و آخرت کی سعادت و خوش بختی کا حصول ممکن پذیر ہے۔

انفرادی اور اجتماعی حقوق

قرآن مجید نے انسانی معاشرے کو عدل و انصاف اور اخوت و برادری کی نعمت سے مالا مال کرنے کے لیے لوگوں کے درمیان انفرادی اور اجتماعی حقوق بیان کر دیئے ہیں تاکہ ہر شخص اپنے حدود و اختیارات کے دائرے میں رہ کر اپنے دوسرے ہمنوع افراد کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کر سکے۔ ظاہر کہ جب ہر شخص اپنی حدود میں رہتے ہوئے اپنے حقوق کا تحفظ کرے گا تو پورا معاشرہ عدل و انصاف سے ہمکنار ہو جائے گا اور ہر فرد' سکون و اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کر سکے گا لیکن جوں ہی افراد کی نظریں ایک دوسرے کے حقوق پر پڑیں گی اور اپنے حقوق کے تحفظ کی بجائے دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ زنی ہوگی تو معاشرے میں فتنہ و فساد' قتل و غارت' دھوکہ و فریب' جبر و تشدد' لوٹ مار اور ظلم و استبداد کا دامن وسیع تر ہوتا چلا جائے گا اور لوگوں کا امن و امان بے چینی و اضطراب میں تبدیل ہو جائے گا اور نوع انسانی کی فطری عظمتیں پامال ہو کر رہ جائیں گی۔

انسانی حقوق کا احترام اور معاشرتی روابط میں فطری تقاضوں کی تکمیل کے لیے قرآن مجید نے گوناگوں موضوعات کے ذیل میں تاکید کی ہے' کہیں تاریخی واقعات کے ضمن میں انسانی اقدار کا استحصال کرنے والے افراد کو نتائج کی سنگین صورت حال سے متنبہ کیا اور کہیں اخلاقی جرائم کے ارتکاب پر کیفر کردار تک پہنچنے والوں کی عبرت ناک داستانوں کا تذکرہ کر کے انہیں معاشرے کے

منفور ترین طبقے میں شمار کیا۔ کہیں تخت و تاج کے طمع میں انسانوں کے قتل عام کا ارتکاب کرنے والوں کی مذمت کرتے ہوئے انہیں دنیا کی فنا پذیر زندگی کے مقابلے میں آخرت کے مہلک اور جاں سوز عذاب سے خوف دلایا اور کہیں مادی قوت کے سہارے معنوی قدروں کو تہ تیغ کرنے کے مذموم عمل سے معاشرے کو گوناگوں برائیوں اور قبیح حرکتوں کی راہ پر لگا دینے والے انسانیت کے قاتلوں کے انجام کا تذکرہ کرکے فحشاء و منکرات کے فروغ کا راستہ روکنے کے لیے سخت سے سخت سزاؤں کا ذکر کیا۔

لیکن اس سب کچھ کے باوجود قرآن نے انسان کو اس کی عظمت اور تکوینی شرف کے معیاروں سے بھی آگاہ و مطلع کر دیا تاکہ تصویر کے دونوں رخ واضح ہو جائیں۔ مثال کے طور پر معاشرے کے تمام افراد کو اتفاق و اتحاد، محبت و اخوت اور وحدت و ہم آہنگی کی دعوت دیتے ہوئے آپس میں مل جل کر رہنے اور باہمی تعاون سے زندگی گزارنے کا درس دیا اور ہر قسم کے اختلاف و افتراق اور تشتت و پراکندگی سے منع کیا، چنانچہ اس سلسلے میں ارشاد ہوا:۔

"وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا" یعنی اللہ کی رسی کو مضبوط سے تھامے رکھو اور آپس میں تفرقہ پیدا نہ کرو۔

قرآن مجید کا یہ معاشرتی اصول درحقیقت اخلاقی عظمتوں کا محافظ و پاسبان ہے اس لیے کہ جب کسی معاشرے میں تمام افراد باہمی تعاون، یک جہتی، ہم فکری اور ہم آہنگی سے کام کریں تو اس صورت میں وہ معاشرہ دنیا کے ہر معاشرے سے قوی و مستحکم اور خوش حال و سعادت مند ہوگا کیوں کہ اس طرح کئی انسانوں کی قوتیں، صلاحیتیں اور افکار و نظریات ایک ہی زاویے پر مرتکز ہو جائیں گے اور ہر

آنے والی مشکل اور درپیش مسائل کے حل کے لیے ایک دوسرے کی سوچ اور فکری قوت سے معقول و مناسب راہ حل تلاش کی جاسکے گی لیکن اگر معاشرے کے تمام افراد الگ الگ معیار اور نقطہ نگاہ رکھتے ہوں اور ہر ایک کا راستہ جدا جدا ہو تو نہ صرف اپنی معاشرتی مشکلات پر قابو نہ پا سکیں گے بلکہ اپنے دشمنوں کو بھی اس بات کا موقع فراہم کریں گے کہ وہ ان کے اختلاف و افتراق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہو سکیں اور جب صورت حال اس طرح ہو جائے تو پھر اس معاشرے کی بقا و استحکام کو خطرات لاحق ہو جائیں گے اسی لیے خداوند کریم نے قرآن مجید مین اتحاد و یک جہتی پر زور دیا اور اسے ایک آئیڈیل معاشرے کے استحکام واستقلال کے لیے نہایت ضروری قرار دیا ہے۔ چنانچہ تاریخ بشریت اس حقیقت پر گواہ ہے کہ وہ قومیں جو فکر و عمل کے اتحاد سے باہمی تعاون و تفاہم سے کام لیتی رہیں' ان کا کردار تاریخ ساز بن گیا اور ان کی یک جہتی و ہم فکری سے ان کی تاریخ دوسری اقوم کے لیے کردار ساز واقع ہوئی' لیکن اس کے برعکس اقوام و ملل آپس میں الجھ گئیں' وہ ایک دوسرے کی قوتوں اور صلاحیتوں سے معاشرتی مسائل کو حل کرنے کی بجائے ایک دوسرے کے مقابلے میں قوت آزمائی اور اظہار قدرت و برتری کرکے اپنی تاریخ کے مقدس دامن کو قتل و غارت اور خونریزی کے ذریعے داغدار کر گئیں لہٰذا قرآن مجید نے ایسے ہی واقعات کی تلخی انجام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اقوام عالم کو متحد و متفق رہنے کی تاکید کی اور سب کو ایک ہی پرچم توحید کے سائے میں رہ کر معاشرتی تقاضوں کی تکمیل کا درس دیا۔ ظاہر ہے کہ جب معاشرے کے تمام افراد باہمی تعاون کی روش اختیار کر لیں گے تو پھر ایک دوسرے کے اخلاقی' معاشرتی' اقتصادی اور سیاسی و سماجی تمام حقوق کا احترام کریں گے اور کوئی شخص غلط

وناجائز طور پر کسی کے حقوق غصب و پامال کرنے کی سوچ پیدا ہی نہ کر سکے گا۔

کردار و گفتار میں ہم آہنگی

انسانی معاشرے کی بقاء کے لیے قرآن مجید نے جہاں دوسرے شعبوں کے لیے حیات بخش اصول بتائے ہیں اور لوگوں کو ان اصولوں پر عمل کر کے معاشرے کی فلاح و صلاح کی راہ پر گامزن ہونے کی تاکید کی ہے وہاں قول و فعل اور گفتار و کردار کی ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ لفظ و عمل کی وحدت پر زور دیا ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو در حقیقت یہ انسانی معاشرے کا اخلاقی اصول ہے۔ جسے قرآن مجید نے اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کیا ہے:۔

"لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالاَ تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَاللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالاَ تَفْعَلُوْنَ"

یعنی وہ بات کہتے ہی کیوں ہو جس پر خود عمل نہیں کرتے' خداوند عالم کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے کہ تم وہ کچھ کہو جو تم خود بجا نہیں لاتے۔

یقیناً" انسانی معاشرے کی عظمت کا راز اسی میں مضمر ہے کہ اس کے تمام افراد کردار و گفتار میں ہم آہنگی و ہم رنگی پیدا کریں اور قول و عمل کے اتحاد و یگانگت سے اپنے ظاہر و باطن کو انحراف و کجروی سے بچائیں' جو لوگ گفتار و کردار کے تضاد کا شکار ہو جاتے ہیں گویا وہ اپنے معاشرے میں خود اعتمادی یا بقول علامہ اقبالؒ "احساس خودی" سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور جس قوم کے افراد میں اپنی عظمت کا احساس ہی ختم ہو جائے وہ نہ صرف یہ کہ دوسروں کے لیے نمونہ عمل نہیں بن سکتی بلکہ اپنے لیے بھی ترقی و تکامل کی راہ ہموار کرنے سے قاصر

رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں بار بار اس امر کی تاکید کی گئی ہے اور انسان کو ماضی کی تصویریں دکھا دکھا کر حال و مستقبل کی تعمیر کے لیے اچھے رہنما اصول بتائے گئے ہیں اور جن قوموں کا زوال ان کے کردار و گفتار اور فکر و عمل میں اختلاف کی وجہ سے واقع ہوا' ان کا تذکرہ قرآن مجید نے ایسے ناصحانہ انداز میں کیا کہ اگر موجودہ زمانے کے افراد ان تلخ حقائق سے سبق حاصل کرتے ہوئے خود سازی کی راہ پر گامزن ہونا چاہیں تو قرآن مجید کے بتائے ہوئے رہنما اصولوں پر عمل کر کے سعادت ابدی کا حصول ممکن ہو سکتا ہے۔

قرآن مجید نے ان علل و اسباب کو بھی اشاروں اشاروں میں بیان کر دیا ہے جو اقوام عالم کے زوال کا باعث بنے اور ان امور کو بھی ذکر کیا جن سے ماضی کے واقعات کے تکرار کی راہ ہموار ہو سکتی ہے یا روکی جا سکتی ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ معاشرہ ہمنوع افراد کے مجموعے کا دوسرا نام ہے جس میں ہر فرد اپنی حیثیت میں آزاد و مختار ہے لیکن اس کے باوجود وہ دوسرے افراد کا محتاج اور ان سے وابستہ بھی ہے۔ کیونکہ معاشرتی زندگی میں عمومی احتیاجات کا حل ایک دوسرے کی قوتوں اور صلاحیتوں سے استفادہ کرنے ہی سے ممکن ہے اور جب متعدد قوتیں ایک زاویے پر متمرکز ہوں تو یقیناً" مشکلات پر قابو پانا بھی آسان ہو سکتا ہے لیکن اگر ہر شخص اپنی وجودی صلاحیتوں کو علیحدہ اور الگ طور پر بروئے کار لائے تو نہ صرف یہ کہ وہ اپنی مشکلات پر قابو پانے میں کامیاب نہ ہو سکے گا بلکہ ایک آئیدیل معاشرے کی تشکیل اور اس کے استحکام میں بنیادی کردار بھی ادا نہ کر سکے گا لہٰذا یہ بات مسلم الثبوت ہے کہ کسی معاشرے کی حیات اس کے افراد کے باہمی تعاون ہی سے ممکن ہے اسی لیے

قرآن مجید نے باہمی تعاون کے معاشرتی اصول کا معیار معین کر دیا ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہوا:۔

"تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرّ وَ التَّقْوٰی وَلاَ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ"

یعنی ایک دوسرے کے ساتھ نیکی اور پرہیزگاری کی بنیادوں پر تعاون کرو اور گناہ و معصیت پر تعاون نہ کرو۔

قرآن مجید نے معاشرتی روابط کے اس اخلاقی قانون میں باہمی تعاون کا معیار نیکی اور تقوی کو قرار دیا ہے جس سے یقینی طور پر افراد کی معنوی قدریں اجاگر ہو سکتی ہیں اور مادی ترقی کے ساتھ ساتھ روحانی پیش رفت کی راہ بھی ہموار ہو سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ گناہ و معصیت ہی کسی معاشرے کی تباہی اور نابودی کا باعث بنتی ہے جو معاشرہ گناہ میں آلودہ ہو اور معصیت کی راہ پر گامزن ہو اس کا زوال اغیار کی یلغار کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ جوں ہی وقت گزرتا چلا جاتا ہے اس کا قہقرائی سفر اپنے معکوس ہدف کی جانب تیز تر ہوتا چلا جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ معاشرہ نیستی اور نابودی کے کنارے پر پہنچ جاتا ہے البتہ نیکی اور پرہیزگاری کو معیار تعاون قرار دیتے ہوئے زوال و اضمحلال کی جانب بڑھتے ہوئے کاروان بشریت کو بقاء و استحکام کی راہ پر لگایا جا سکتا ہے۔ وہ لوگ جو اپنی قوتوں کو "بر" اور "تقوی" کے فروغ پر صرف کرتے ہیں دراصل معاشرے کے زندہ دل اور باوقار افراد بھی وہی کہلاتے ہیں۔

" بِرّ " جس کا معنی عام طور پر "نیکی" کیا جاتا ہے اس کی بابت انسانی

معاشرے میں کسی قسم کی محدودیت نہیں بلکہ یہ مقدس اور پاکیزہ مفہوم تمام شعبہ ہائے زندگی میں ہمہ گیر حیثیت کا حامل ہے اور ہر شعبے کی عظمت اور امتیازی خصوصیت کی واضح علامت بن جاتا ہے' اسی طرح تقوی بھی کسی خاص شعبہ زندگی سے مختص نہیں اور نہ ہی اس کی عمومیت اور جامعیت کو محدودیت کی زنجیروں میں جکڑا جا سکتا ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ انسانی معاشرے کے ہر پہلو میں نہ صرف متصور ہے بلکہ متحقق بھی ہو سکتا ہے اور اس کے تحقق پذیر ہونے کا امکان بہت قوی بنیادوں پر استوار ہے' خواہ وہ اخلاقی شعبہ ہو یا اقتصادی' عبادت کے امور ہوں یا معاملات کے مسائل' سیاسی موضوعات ہوں یا اجتماعی و معاشرتی امور' ہر امر میں تقوی کا حکم موجود ہے' تقوی کی جامعیت کا اصل فلسفہ یہ ہے کہ اگر کوئی اخلاقیات میں متقی ہو لیکن اقتصادیات میں تقوی کے اصولوں کو پامال کرے' وہ کامل پرہیزگار نہیں بن سکتا۔ اسی طرح عبادت و معاملات اور معاشرتی روابط میں بھی ایسا ہے لہٰذا انسانی معاشرے کے تمام افراد پر دو اہم فرض عائد کئے گئے ہیں۔ پہلا یہ کہ انفرادی طور پر ہر شخص اپنی زندگی کے تمام شعبوں میں تقویٰ اختیار کرے اور دوسرا یہ کہ معاشرے میں اجتماعی طور پر تقویٰ کے اصولوں کی پاسدادی کرتے ہوئے ان کے فروغ کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیا جائے' ان دونوں فرائض کو صحیح طور پر انجام دینے سے ایک آئیڈیل انسانی معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے اور یہی قرآنی دستور ہے جو معاشرے کے ہر فرد پر عائد و نافذ ہوتا ہے۔

تقویٰ انسانی معاشرے کے لیے قرآن مجید کا ایسا درخشندہ اصول ہے جو تمام افراد پر برابر نظر رکھتا ہے اور معاشرے کا کوئی فرد اس حیات بخش قانون سے مستثنیٰ نہیں۔ قرآن مجید نے اس پاکیزہ دستورالعمل کو اپنانے کی بھرپور تاکید کی ہے

تاکہ افراد معاشرہ کی شخصی و انفرادی زندگی کے ساتھ ساتھ اجتماعی و معاشرتی حیات کو بھی کمال حاصل ہو سکے۔ یہ تو ہے تصویر کا مثبت پہلو' لیکن اگر تصویر کے دوسرے رخ کو دیکھا جائے تو قرآن مجید ہر ایسے عمل سے منع کرتا ہے جو انسانی معاشرے کی قبائے عظمت کے پاکیزہ دامن کو گناہ اور معصیت کے بدنما دھبوں سے داغدار کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید اپنی سعادت بخش تعلیمات میں نیکی اور تقویٰ پر اجتماعی تعاون کو صرف ایک اخلاقی حکم ہی نہیں بلکہ اسے ایک دستور' فرمان (ORDER) اور حتمی و قطعی فیصلے کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اسی آیت کے جاری سلسلے میں "وَلاَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" کے مخصوص انداز میں ارشاد ہوا کہ گناہ و معصیت پر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون نہ کرو' گویا دوسرے لفظوں میں قرآن مجید نے انسانی معاشرے کو ایک صحت مند' باسلامت' پروقار' باعظمت اور تقدس ماب معاشرے کی صورت دینے کے لیے ہر نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کو لازمی و ضروری امر قرار دیا ہے اور ہر قسم کی برائی اور معصیت سے دور رہنے اور دوسروں کو بھی قبیح اعمال اور ناپسندیدہ افعال کے ارتکاب سے بچانے کے لیے مناسب و موزوں طریقے کی نشاندہی کی ہے۔ قرآن مجید نے انسان اور انسانی معاشرے کو ابدی سعادت سے ہمکنار کرنے کے لیے متعدد مقامات پر اور گوناگوں آیات کے ضمن میں ایسے رہنما اصول بتائے ہیں جن پر عمل کر کے معاشرے کے تمام افراد خوش حالی اور خوش بختی کی نعمتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ افراد کی قوتیں اور صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں اور طبعی طور پر ان میں فرق پایا جاتا ہے لیکن ان صلاحیتوں کے تمرکز اور یگانگت

و اتحاد سے معاشرے کی اہم مشکلات حل ہو سکتی ہیں اور تمام افراد سکون و آرام کی زندگی بسر کرنے میں کامیابی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کی تاکید کی اور اختلاف و پراگندگی سے سخت منع فرمایا ہے' چنانچہ ارشاد ہوا:۔

"وَلاَ تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَائَتْهُمُ الْبَيِّنَاتِ وَ اُوْلٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ----------"

یعنی تم ان لوگوں جیسے نہ بنو جو واضح دلائل آنے کے باوجود اختلاف اور تفرقہ کا شکار ہو گئے اور انہی لوگوں کے لیے عذاب عظیم ہے۔ (سورۂ آل عمران' آیت ۱۰۵) اس آیت میں خداوند عالم نے لوگوں کو اختلاف اور تفرقہ بازی سے پرہیز کرنے کا حکم دیا ہے اور اس امر کی تاکید کی کہ واضح دلائل کے باوجود جن لوگوں نے تفرقہ بازی کو نہیں چھوڑا ان کی طرح نہ ہو جاؤ' کیوں کہ جو لوگ ایسے اعمال کا ارتکاب کرتے ہیں ان کے لیے خدا نے بہت بڑا عذاب مقرر کر رکھا ہے۔ اس بیان سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ اتحاد و یک جہتی اور باہمی تعاون ہی کسی معاشرے کی ترقی و تکامل کی راہ میں مئوثر ہے اور قرآن مجید اپنے اس مقدس معاشرتی اصول میں تمام لوگوں کو ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہو کر انسانی اقدار کے تحفظ کی دعوت دیتا ہے کیونکہ جب سب انسان ایک ہی خدا کی مخلوق ہیں اور ایک ہی خدا کی طرف لوٹ کر جانا ہے، تو پھر تفرقہ و اختلاف میں پڑ کر اپنی فطری و تخلیقی عظمتوں کا تحفظ و پاسداری کا فریضہ کیونکر ادا کر سکتے ہیں۔؟

قرآن مجید نے متعدد مقامات پر لوگوں کے باہمی تعاون کا تذکرہ کیا ہے اور انہیں ایک دوسرے کی معاشرتی و معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے کی تاکید کی

ہے البتہ اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ ہر انسان اپنے امور زندگی میں گوناگوں احتیاجات اور مشکلات و مسائل سے دوچار ہوتا ہے لیکن کچھ لوگ خداوند عالم کی عنایتوں سے بہرہ ور اور مستفید ہو کر اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کے ذریعے سے اپنی مشکلات و مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کی بھرپور صلاحیت حاصل کر لیتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو انفرادی طور پر تو اپنی مشکلات پر قابو پا لیتے ہیں مگر اجتماعی صورت میں کچھ کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ لہٰذا اس صورت حال کے پیش نظر قرآن مجید نے معاشرے کے افراد کو ایک متعادل روش اپنانے کی تاکید کی ہے اور وہ یہ کہ جو افراد صاحب ثروت اور اپنے فردی مسائل کے ساتھ ساتھ اجتماعی و معاشرتی مسائل میں نمایاں کردار ادا کر سکتے ہیں لیکن مال دنیا کی محبت ان کے دلوں میں گھر کئے ہوئے ہے تو انہیں چاہیے کہ اپنی حریم طبیعت میں چھپے ہوئے شیطان کو پائے عزم و استقامت سے پامال کر کے اپنی فطری عظمتوں کے نورانی محل کی پاکیزہ فضا کو قرآنی دستور کی عملی روشنی سے منور کر دیں۔ اور اپنی نہایت محبوب و پسندیدہ چیزوں کو نیکی و احسان کی راہ میں صرف کر کے خدا اور خلق خدا کے نزدیک عظمت' عزت' وقار اور سرفرازی حاصل کریں چنانچہ ایسے ہی افراد کے بارے میں قرآن مجید نے اپنے مخصوص انداز اور ہدایت آمیز لہجے میں ایک ٹھوس اور واضح اصول کی نشاندہی ان الفاظ میں کی ہے:۔

"لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْم"

یعنی تم ہرگز نیکی نہیں پاسکو گے جب تک کہ ان چیزوں کا انفاق نہ کرو جنہیں دوست رکھتے ہو اور جن کی محبت تمہارے دلوں میں گھر کر چکی ہے اور تم جو کچھ نیک راہ میں خرچ کروگے' اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔

اس آیت میں قرآن مجید نے نیک کاموں میں انفاق اور دل کھول کر اپنی مالی توانائیاں صرف کرنے کی تاکید کرکے معاشرے کے افراد کو اجتماعی مسائل میں باہمی تعاون کی ترغیب دلائی ہے چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ایک بزرگ صحابی ابو طلحہ نے اپنا قیمتی باغ خدا کی راہ میں دے دیا تو پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا کہ اے ابو طلحہ! خداوند عالم تیری اس نیکی' نیک نیتی اور نیک عمل کو مبارک کرے کیونکہ جو مال تونے اللہ کی راہ میں خرچ کیا ہے وہ تیرے لیے دنیاوی منافع کا ذریعہ تھا اور تجھے اس سے کافی مالی فوائد حاصل ہوتے تھے لیکن اس کے مقابلے میں اخروی فوائد جو تونے حاصل کیے ہیں اور معنوی و روحانی منافع کمائے ہیں' ان کا شمار ہی نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح روایت تفسیر میں وارد ہوا ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے وقت کئی مسلمانوں نے اپنے پسندیدہ اموال خدا کی راہ میں دے دیئے۔ اگر کسی کے پاس کوئی غلام یا کنیز تھی تو اس نے اسے اللہ کی راہ میں دے دیا اور اگر کسی کے پاس کوئی قیمتی اور پسندیدہ شے تھی تو اس نے اسے رضائے الٰہی کے حصول کے لیے صرف کر دیا تو ان سب کے ایسا کرنے سے مسلمان معاشرے کو مالی لحاظ سے اور معاشی امور میں بہت استقلال ملا اور لوگ خوش حال و صحت مند ماحول میں زندگی بسر کرنے کی نعمت سے لطف اندوز ہونے لگے۔ آج بھی ایک انسانی معاشرہ اپنے استحکام کے لیے باہمی تعاون' تفاہم' ہم آہنگی' یک جہتی' اخوت

و برادری اور قرآن مجید کے بتائے ہوئے رہنما اصولوں کی روشنی میں اپنے مادی و معنوی، جسمانی و روحانی، انفرادی و اجتماعی، سیاسی و اقتصادی اور اخلاقی و معاشرتی مشکلات و مسائل کو حل کر سکتا ہے۔ قرآنی تعلیمات کسی خاص قوم و قبیلے زمان و مکان اور حالات و واقعات سے مختص نہیں بلکہ اس کی ابدی حقیقت اور آفاقی حیثیت ہر دور میں اپنی تاثیر دکھاتی ہے اور قرآن مجید اپنے روشن اصولوں کے ذریعے معاشرے کے افراد کو سعادت مند زندگی بسر کرنے کا درس دیتا ہے لہٰذا یہ کہنا نہایت بجا و موزوں ہے کہ قرآن مجید کی پاکیزہ تعلیمات اور اس کے مقدس رہنما اصولوں کا اولین مقصد اور بنیادی و آخرین ہدف انسانوں کی صلاح و فلاح اور انسانی معاشرے کی بقا و استحکام کے سوا کچھ بھی نہیں۔

انہدام جنت البقیع: حادثہ یا سازش

۸ شوال کا دن ہر سال انہدام جنت البقیع کی یاد تازہ کرتا ہے۔ اس دن مدینہ منورہ (سعودی عرب) کے تاریخی قبرستان جنت البقیع میں بزرگان دین آئمہ معصومین ؑ کے مزارات مقدسہ کو منہدم کر دیا گیا۔ یہ المناک واقعہ ۸ شوال ۱۳۴۴ھ بمطابق ۲۱ اپریل ۱۹۲۵ء کو رونما ہوا۔

دنیا میں لادین افراد بھی اپنے ماسلف بزرگوں کی یادگاروں کا تحفظ کرتے ہیں تاکہ انہیں دیکھ کر ان کی یاد تازہ رہے اور ان کی تعلیمات و اصولوں سے وابستگی کا عملی جذبہ ہمیشہ بیدار رہے لیکن افسوس کہ مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی پیدا ہو گئی ہے جس کے اعتقاد کی بنیاد پر یہ سب کچھ "حرام" قرار دے دیا گیا ہے اور صرف یہی نہیں کہ اس عقیدہ و نظریہ کو اپنی حد تک محدود رکھا جائے بلکہ اسے دوسروں پر مسلط کرنے اور اس پر زبردستی عمل کروانے کی تاکید بھی کی جاتی ہے جو کہ اسلامی اصولوں کے منافی ہے۔

ہر شخص کو اعتقادات میں یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس عقیدہ کو اپنائے' یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے لیکن دوسروں کو بھی اسی اصول کے تحت

عقیدہ رکھنے اور اپنے عقیدہ کا دفاع کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیے بہرحال فرقہ وہابیہ کی اصل حقیقت اور اس کے عقائد پر تفصیلی بحث و جرح کسی اور مقام پر کی جائے گی۔ اس وقت ہمارے سامنے جنت البقیع کے انہدام کا واقعہ ہے جس سے دنیا بھر کے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے اور جس سال یہ واقعہ رونما ہوا' پورے عالم اسلام سے صدائے احتجاج بلند ہوئی اور سانحہ کے عاملین کی مذمت اور مزارات مقدسہ کی تعمیر نو کا مطالبہ کیا گیا لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا بلکہ اس کی مزید تخریب کا پروگرام بنا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے خلاف اٹھنے والے طوفان کو دبا دیا گیا ہو۔

راقم الحروف کو اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں ۱۹۷۸ء میں حج کی سعادت حاصل کرنے گیا تو اس وقت جنت البقیع میں مزارات مقدسہ کی نشانات پتھروں کی شکل میں موجود تھے اور ہم نے قریب کھڑے ہو کر آئمہ معصومینؑ اور بزرگان دین کے منہدم شدہ مزارات کے پتھروں کی زیارت کر کے اپنی عقیدت کا اظہار آہوں و اشکوں کے ساتھ کیا لیکن اب تازہ ترین صورت حال یہ کہ ان شکستہ پتھروں کو بھی ہٹا دیا گیا ہے اور احاطہ کو چھوٹے چھوٹے پتھروں کے ساتھ اس طرح محدود کر دیا گیا ہے کہ کسی قبر کا نشان واضح نہیں صرف اتنا ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس احاطہ میں کچھ مزارات و قبور تھیں۔ اس کے علاوہ کوئی نشان موجود نہیں اور اسی احاطہ کے اردگرد کھڑے ہو کر عقیدت مند اپنی پیاس بجھا کر لوٹ آتے ہیں۔

انہدام جنت البقیع ایک حادثہ ہے یا سازش یا کچھ اور؟ اس کا فیصلہ تو ارباب تحقیق و اہل نظر حضرات خود ہی کریں گے تاہم اس حد تک کوئی شک

نہیں کہ یہ عمل اسلامی روایات و اصولوں کے منافی ہے اسے کسی بھی طرح سے درست قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ اس کی صحت پر مہر تصدیق ثبت کرنا اسلامی حقائق کی اہانت کے برابر ہے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہنا بھی بے جانہ ہوگا کہ یہ عمل انسانی اصولوں کے بھی خلاف ہے کیونکہ دنیائے انسانیت میں یادگاروں کا باقی رکھنا نہ فقط یہ کہ برا نہیں بلکہ ایک مستحسن عمل سمجھا جتا ہے جو قومیں اپنے ماسلف بزرگوں کی یادگاریں محفوظ کرتی ہیں' ان کا نام و تذکرہ تاریخ میں نہایت اچھے انداز میں ہوتا ہے لیکن معلوم نہیں اسلام کے دعوے دار حکمرانوں کو ان اعمال سے کیا کچھ حاصل کرنا مقصود ہے کہ وہ اس اقتدار کے نشے میں بزرگوں کی یادگاریں منہدم کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

میں ان حکمرانوں سے صرف یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ اگر بزرگوں کی یادگاریں باقی رکھنا وہابی مسلک کے خلاف ہے تو پھر ہوائی اڈوں اور شاہراہوں کو اپنے زندہ و مردہ بزرگوں کے نام سے موسوم کرنے کی بدعت کیوں کی جاتی ہے اور پھر اپنے ناموں کی تختیاں نصب کروانے کا کیا جواز ہے؟۔ آہا ایسا کرنا وہابی شریعت میں روا ہے؟ اپنے بزرگوں کے ناموں پر تو جگہ جگہ یادگاریں قائم کی جاتی ہیں لیکن رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد و عترت اور بزرگان دین و آئمہ معصومین علیہم السلام کی یادگاریں مٹائی جار ہی ہیں؟۔ یہ کہاں کا انصاف اور کون سی شریعت و فقہ کا اصول ہے اور کہاں کا انسانی آئین و دستور ہے کہ اپنے نظریات و عقائد کو دوسروں پر زبردستی مسلط کرکے مقتدر بزرگوں کی یادگاریں محو کر دی جائیں۔

جن مزارات مقدسہ کو منہدم کیا گیا ان میں اسلام کی نہایت قابل

احترام ہستیوں کی قبور مبارکہ شامل ہیں جن میں حضرت سیدہ نساء العالمین فاطمہ زہراء بنت رسول اللہ ؐ، حضرت امام حسن ؑ مجتبی، حضرت امام علی زین العابدین، حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق سرفہرست ہیں۔

کاش ایسا کرنے والے اپنے انجام اور آخرت کے حساب و کتاب کو خاطر میں لاتے اور ان معصوم و مظلوم ہستیوں کی قبور مطہرہ کو اپنے ظالمانہ نظریات کا شکار نہ کرتے، اسکے علاوہ ظلم بالائے ظلم یہ کہ ان منہدم شدہ مزارات کی زیارت کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں، وہاں زیارت پڑھنے والوں کو دھکے دیئے جاتے ہیں اور ان کے ساتھ غیرانسانی اور غیراسلامی سلوک کیا جاتا ہے، فحش کلامی اور نہایت ترش لہجے میں بات کی جاتی ہے۔ خواتین کو قبرستان میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی اور آئمہ معصومین کی ٹوٹی و مسمار شدہ قبروں کے باقی ماندہ آثار تربت کا دیدار کرنے والوں کو خود ساختہ فقہ و شریعت کے فتوؤں کے تازیانے لگائے جاتے ہیں۔ معلوم نہیں ایسا کرنے والے حکام بنی امیہ و بنی عباس کی سیاہ تاریخ دھراکر کسے خوش کرنا چاہتے ہیں؟۔

ان مزارات مقدسہ کی تعمیر نو کا مطالبہ تو اب قصہ پارینہ ہو چکا ہے اب تو ان کی جگہ پڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے پتھروں کی زیارت کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ آخر یہ سب کچھ نہ انسانی حقوق کی عالمی تنظیموں کو نظر آتا ہے اور نہ ہی اسلامی کانفرنس کے سربراہوں کو کچھ دکھائی دیتا ہے۔ کوئی بھی ان مذموم حرکتوں کا نوٹس نہیں لیتا۔

ہم ان حکام اور ان کی ان غیراسلامی و غیرانسانی حرکتوں میں ان کا ساتھ دینے والوں کو خدا کے عذاب اور دنیا میں ذلت و رسوائی سے دوچار ہونے سے

خبردار کرتے ہیں کہ اگر یہ سلسلہ اسی طرح باقی و جاری رہا تو مظلوموں کی آہوں اور سسکیوں کا سیلاب ان حکام کی سلطنتوں کے کچے خیمے تباہ کر دے گا اور پھر وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے کیونکہ ظالم کا انجام دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب کے سوا کچھ نہیں۔

ہم انسانی حقوق کی علمبردار عالمی تنظیموں کی توجہ جنت البقیع کے شکستہ پتھروں کی طرف دلاتے ہیں اور ان سے بھرپور مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کرکے مزارات مقدسہ کی تعمیر نو کی راہ ہموار کریں اور انسانیت کے نام پر ان عظیم یادگاروں کو محفوظ کرنے میں مدد دیں۔ یہ مسئلہ جہاں عقیدتی حوالہ رکھتا ہے وہاں انسانی حوالہ سے بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

انہدام جنت البقیع کے سلسلے میں احتجاجی تحریک بھی جاری ہے اور یہ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک سعودی عرب کے حکمران مزارات مقدسہ کی تعمیر نو کو یقینی نہیں بناتے۔

بہرحال ارباب دانش و اہل ذکر و نظر اس گھناؤنے واقعہ پر جس طرح ہر سال اظہار خیال کرتے ہیں اور اسے غیرانسانی و غیراسلامی عمل قرار دیتے ہیں اس سے اس بات کا اندازہ لگانا آسان ہے کہ یہ اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ سوچی سمجھی سازش کا عملی نتیجہ ہے۔

۲۸ رمضان ۱۴۱۸ھ

فروری ۱۹۹۸ء

امریکہ اور ایران: مفاہمت کی نئی کوششیں!

ایران میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد امریکہ نے مختلف طریقوں سے ایرانی قوم کو عدم تحفظ کا شکار کرنے کی غرض سے اقدامات کئے۔ جن میں طاقت کے استعمال' فوجی حملوں' عراق کے ذریعے جنگ مسلط کرنا اور عالمی سطح پر سیاسی و اقتصادی بائیکاٹ وغیرہ شامل ہیں لیکن حقائق اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ امریکی کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں اور ہربار امریکہ کو منہ کی کھانی پڑی۔

اپنی تمام تر معاندانہ و دشمنانہ کاروائیوں میں ناکامی کے بعد امریکہ کی خفیہ ایجنسیوں نے اپنے مؤقف میں تبدیلی پیدا کی اور مخالفت و تنازع کی صورت میں ایران کو اپنے زیر اثر کرنے کی پالیسی ترک کرکے دوستی اور دو طرفہ تعلقات کے فروغ کا راستہ اختیار کیا جو کہ یقیناً" اپنی حد تک ایک دوسری طرح کی چال و سازش کہلا سکتا ہے۔ گذشتہ دنوں اخبارات نے نہایت اہمیت و اہتمام کے ساتھ یہ خبریں شائع کی ہیں کہ امریکی حکومت نے ایرانی رہنماؤں سے "استدعا" کی ہے کہ وہ براہ راست امریکہ کی حکومت سے ڈائیلاگ کا آغاز کرے تاکہ ان دونوں ممالک کے درمیان مفاہمت کے ایک نئے دور کا سلسلہ شروع ہو سکے۔ امریکی

حکومت کے سرکاری ترجمان کی جانب سے پہلی مرتبہ یہ ظاہر ہوا ہے کہ امریکہ ایران کے ساتھ بہتر تعلقات استوار کرنے اور ماضی کی غلط فہمیوں کو دور کرنے میں کتنی گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ امریکی حکومت نے ایران کے ساتھ براہ راست بات چیت کی پیش کش ایرانی صدر خاتمی کے امریکی عوام سے ٹیلی ویژن پر خطاب کے بعد کی۔ واضح رہے کہ ایرانی صدر سید محمد خاتمی نے امریکی ٹیلی ویژن نیٹ ورک سی این این کو پہلی مرتبہ انٹرویو دیتے ہوئے امریکی "عوام" کو جمہوری قدروں کا احترام کرنے پر زبردست خراج تحسین پیش کیا اور انہیں اس انٹرویو کے ذریعے ایران کی حکومت اور ایران کے عوام کے خلاف ماضی میں امریکی حکمرانوں کی مذموم کاروائیوں سے آگاہ کیا۔ ایرانی صدر کے انٹرویو اور امریکی عوام سے خطاب کو امریکی عوام کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کی امن پسند قوتوں نے خوب سراہا اور یہ امید ظاہر کی کہ اس انٹرویو کے بعد امریکی اور ایرانی حکومتوں کے درمیان کسی حوالہ سے مفاہمت کا آغاز ہو سکے گا۔

ایرانی صدر جو کہ لبرل خیالات کے حامل ہونے کے حوالہ سے عالمی سطح پر شہرت رکھتے ہیں ان کے بارے میں اندرون ملک اور بیرون ملک سیاست دانوں اور ایرانیات کے ماہرین کے درمیان یہ بات تواتر کے ساتھ کہی جاتی ہے کہ وہ ایک اعتدال پسند رہنما ہیں جو مغربی ممالک کے علاوہ امریکہ سے بھی بہتر تعلقات کی از سرنو بحالی چاہتے ہیں تاہم اس سلسلے میں ابھی تک ایران کے اندر سخت مؤقف کے حامی افراد اس بات سے اتفاق نہیں کر رہے کہ ایران فوری طور پر امریکہ سے بہتر تعلقات استوار کرے۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ امریکہ نے شاہ ایران کے دور اقتدار میں ایرانی قوم کا زبردست استحصال کیا اور ایرانی دولت

لوٹ کر شاہ ایران کو علاقہ کا پولیس مین بنانے کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کی اور ایران کے اسلامی انقلاب کو ناکام کرنے کے لیے اس نے عراق کے ذریعے ایران پر طویل جنگ مسلط کی جسے ایرانی عوام کے جذبہ جہاد نے بری طرح ناکام بنا دا۔ یاد رہے کہ ایران کے اربوں ڈالر کے اثاثے امریکہ میں ہیں جن کی واپسی نہیں ہوئی تو ان حالات میں ایران کے امریکہ کے ساتھ تعلقات کیونکر بہتر ہو سکتے ہیں لیکن ان خیالات سے قطع نظر بعض تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ ایرانی صدر کے انٹرویو سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ ایرانی حکومت ماضی کی تلخیاں بھلا کر امریکہ کے ساتھ ایک نئے دور کا آغاز چاہتی ہے اور صدر نے جو باتیں امریکی عوام سے کی ہیں وہ درحقیقت بالواسطہ امریکی حکومت سے ہیں تاکہ ایران کی شکایتوں کے سلسلے میں امریکی رد عمل معلوم ہو سکے اور یہ بھی معلوم ہو سکے کہ امریکہ کس حد تک ایرانی شکایات کا ازالہ کرنا چاہتا ہے۔ دوسری جانب امریکہ کا یہ خیال ہے کہ مشرق وسطی میں اس کی امن کوششوں میں جن ممالک کی جانب سے مزاحمت ہو رہی ہے ان میں ایران کا بڑا عمل دخل ہے بالخصوص لبنان اور مقبوضہ فلسطین میں کہ جہاں بعض گوریلا تنظیموں نے اسرائیل کے ظلم و تشدد کے خلاف جوابی کاروائیاں شروع کر رکھی ہیں لہٰذا امریکی حکام کا خیال ہے کہ ایران کے ساتھ مفاہمت کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ مشرق وسطی میں اس کی امن کی کوششیں کامیاب ہوں گی اور ان گروپوں کی حوصلہ شکنی ہوگی جو اسرائیل فلسطین سمجھوتے کے خلاف برسرپیکار ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ شام جو کہ ایران کا حلیف ہے اگر امریکہ ایران تعلقات میں بہتری پیدا ہوتی ہے تو شام بھی امریکہ سے تعلقات بہتر بنانے پر غور کر سکتا

ہے اور پھر شام و اسرائیل کے درمیان مفاہمت کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ گویا امریکی حکومت ایران کے ساتھ تعلقات کی بہتری میں ایک نہایت وسیع خاکہ رکھتی ہے اور اس خاکہ میں تبھی رنگ پیدا ہو سکتا ہے جب ایران اپنے مؤقف میں لچک پیدا کرکے امریکہ کے ساتھ باہمی تعلقات استوار ہونے پر رضامند ہو' تاہم ظاہری حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اتنی جلدی دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کی بہتری کے امکانات نظر نہیں آتے کیوں کہ امریکہ نے ماضی میں جو غلطیاں کیں ان کا ازالہ بہت مشکل ہے اور ایرانی عوام امریکہ پر اعتماد نہیں کر سکتے۔

حقیقت بھی یہ ہے کہ امریکہ نے ایران کا جس انداز میں استحصال کیا' اس کی دولت و ثروت پر ڈاکہ ڈالا' عوام کو آزادی اظہار رائے سے محروم رکھنے کی سلطنتی پالیسیوں کی عملی حمایت کی اور پھر انقلاب کے بعد اس کی ناکامی کے لئے طاقت کا بے دریغ استعمال کیا اور عالمی سطح پر ایران کا وقار و اعتماد ختم کرنے کے لیے ہر ممکن سیاسی حربہ استعمال کیا اور پھر ایران کے اثاثوں پر غاصبانہ قبضہ جمائے رکھا تو ان حالات کے پیش نظر ایرانی قوم اس پر اعتماد کرنے اور اس کی طرف سے دوستی و مفاہمت کی کوششوں کو کس طرح مثبت نظر سے دیکھ سکتی ہے۔

امریکہ کی ایران کے ساتھ دوستی کو دھونستی کا نام دینا زیادہ مناسب لگتا ہے کیونکہ دوستی کی آڑ میں اپنے شیطانی مفادات کا تحفظ امریکی حکومتوں کا دیرینہ عمل ہے اور برصغیر میں ایران کی سیاسی اہمیت کا احساس بھی امریکی خفیہ ایجنسیوں کو ہے لہٰذا میری نظر میں یہ ایک چال اور سوچی سمجھی سازش ہے کہ امن اور

دوستی کے نام پر ایک بار پھر ایرانی قوم کو اپنے شیطانی عزائم کا شکار کرنے کی ایک سکیم پر عملدر آمد کیا جا رہا ہے۔

ایرانی قوم نے جس جذبہ جہاد و ایثار کے ساتھ سختیوں اور دشواریوں کا مقابلہ کیا' وہ تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ امریکہ اعتدال پسند صدر اور ان سے پہلے لبرل ذہن رکھنے والے صدر ہاشمی اور بعض دیگر حکمرانوں کے مصالحانہ بیانات سے غلط فہمی کا شکار ہوا ہے۔ ایرانی قوم کا استحصال اب ماضی کا قصہ بن چکا ہے اسے دوبارہ نہیں دہرایا جاسکتا۔ تاہم ایرانی حکمرانوں کو بھی اپنے ظاہرا" خوشنما بیانات کے پس منظر کا احساس ہے' وہ امریکہ کے عزائم کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور اس کی عالمی سطح پر امن کوششوں کی حقیقت سے بھی آگاہ ہیں بلکہ دنیا بھر کی قومیں یہ نظریہ رکھتی ہیں کہ امریکہ سے دوستی بھیڑیئے کو گھر میں گھسنے کی اجازت دینے کے مترادف ہے کیونکہ جس کا دوست امریکہ ہو اسے دشمن کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

فروری ۱۹۹۸ء

کوسوو کے مسلمانوں پر مظالم کی انتہا!

یوں تو دنیا بھر میں مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جا رہے ہیں اور ان کے اموال و نفوس اور ناموس کی بے حرمتی کی جا رہی ہے۔ یہ سب کچھ نام نہاد سپر پاورز کے ایماء اور حمایت سے ہو رہا ہے۔ اس وقت متعصّب قوم پرست اور اسلام کے بدترین دشمن سربوں نے کوسوو کے مسلمانوں پر مظالم کی انتہاء کر رکھی ہے۔ ان درندوں نے مسلمان مردوں کی جانوں اور خواتین کی آبرو کو اس طرح روندا ہے اور درندگی کا ثبوت دیا ہے کہ ایک ہفتے کے دوران ڈیڑھ لاکھ سے زائد مسلمان خوف کی وجہ سے پڑوسی ممالک کی سرحدوں میں داخل ہو گئے ہیں' کسووو کے شہروں اور قصبوں میں روزانہ سینکڑوں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔ گلیاں اور سڑکیں ان کے خون سے نہلا گئی ہیں' سرب فوجی مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکال دیتے ہیں۔ مردوں کو گولیوں سے بھون ڈالتے ہیں اور مستورات کی بے حرمتی کرکے ان کے گھروں کو نذر آتش کر دیتے ہیں چنانچہ تازہ رپورٹوں کے مطابق سرب فوجیوں کی ظالمانہ کاروائیوں کے نتیجے میں اب تک ڈھائی لاکھ مسلمان بے گھر ہو چکے ہیں۔ سربوں کی اس اندھی انسانیت کشی پر نیٹو کا ترجمان بھی چیخ اٹھا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ سرب فوجوں نے کوسوو میں

ایسی دہشت پھیلا دی ہے جس کی مثال کمبوڈیا میں قتل عام کے بعد نہیں ملتی۔ بین الاقوامی مبصرین نے کوسوو میں مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے سربوں کے وحشیانہ مظالم کی تصدیق کرتے ہوئے انہیں نہایت سفاکی و درندگی سے تعبیر کیا ہے۔ امریکہ محکمہ خارجہ کے ترجمان نے بھی سربوں کے ظلم و ستم کو حیوانی نسل کشی قرار دیا ہے۔ البانیہ اور مقدونیہ پہنچنے والے مسلمان بوڑھوں' بچوں اور خواتین نے سربوں کے وحشیانہ مظالم کی دلخراش داستانیں بیان کی ہیں۔ سرب فوجیں کوسوو کے مسلمان خاندانوں کو نہایت بے دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار رہی ہیں۔ سینکڑوں مسلمانوں کی بے گور و کفن لاشیں کوسوو کے شہروں اور قصبوں میں بکھری پڑی ہیں۔ عالمی کمیشن برائے انسانی حقوق کے بیان کے مطابق پندرہ لاکھ مسلمان سربوں کے پنجہ استبداد میں پھنسے ہوئے ہیں۔ درندوں کے ہاتھوں سے نجات پانے والے مسلمانوں کے ایک قافلے نے رو رو کر بتایا کہ ایک بہت بڑے سٹیڈیم میں سربوں نے مسلمانوں کو جمع کر رکھا ہے اور کسی بھی وقت ان سب کو قتل کر دیا جائے گا۔ مشین گنوں کے دھانے ان کی طرف اٹھے ہوئے ہیں۔ ادھر اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے پناہ گزینوں کی مدد کرنے کی اپیل کی ہے اور ہمسایہ ملکوں سے کہا ہے کہ وہ اپنی سرحدیں ان پناہ گزینوں پر بند نہ کریں اور ان مظلوموں کو اپنے ملکوں میں داخل ہونے دیں کیوں کہ ان کی جانیں خطرے میں ہیں۔ امریکہ اور نیٹو نے سربیا پر اپنے حملے جاری رکھنے کا اعلان کیا ہے (جو کہ ان کی مکارانہ چالوں کی منہ بولتی تصویر ہے) جب کہ روس نے مصالحتی کوششیں تیز کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ سربوں کے فوجی ٹھکانوں کو بمباری سے بچایا جا سکے۔ امریکہ اور نیٹو کے حملوں کے باوجود (جو

کہ نمائشی عمل سے زیادہ کچھ حیثیت و حقیقت نہیں رکھتے) سربوں نے کوسوو کے مسلمانوں پر بھیانک مظالم کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یورپ کے عیسائی ممالک نے انسانی ہمدردی کی بناء پر کوسوو کے مظلوم پناہ گزینوں سے ہمدردی کا اظہار کیا ہے (جسے ظاہری انسانی حمایت مگر باطنی شیطانی تائید کہا جا سکتا ہے) مگر افسوس ہے کہ مسلمان ممالک نے بھرپور کردار ادا کرنے کی بجائے یا تو خاموشی اختیار کر رکھی ہے یا پھر نہایت محتاط رویہ اپنایا ہوا ہے۔ معلوم نہیں پاکستان کا ایٹم بم اور عربوں کی تیل کی بدولت کب کام آئے گی؟۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اسلامی کانفرنس کی تنظیم حرکت میں آجاتی اور متحد ہو کر مظلوم مسلمانوں کا تحفظ کرتی لیکن ایسا نہیں ہو رہا۔

کوسوو کے مظلوموں کا قصور اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ وہ مسلمان ہیں اور عقیدہ توحید پر قائم ہیں۔ ان کی تاریخ ان کے نظریاتی استقلال کی گواہی دیتی ہے۔ میں مسلمانوں کی مقتدر حکومتوں سے دردمندانہ اپیل کرتا ہوں کہ مشترکہ طور پر اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کو پہنچیں اور انہیں سربوں کی درندگی سے نجات دلائیں ورنہ مسلمانان عالم کی خاموشی یا بے پرواہی کو دیکھ کر سربوں کے حوصلے مزید بڑھیں گے اور وہ اس سے زیادہ مظالم ڈھائیں گے تاکہ کوسوو سے مسلمانوں کو ختم کر دیا جائے۔ انسانی حقوق کی عالمی تنظیمیں بڑی طاقتوں سے وابستگی کی وجہ سے بھرپور کردار ادا نہیں کرتیں اس لیے تمام تر ذمہ داری مسلمان حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے کہ وہ کوسوو کے غیور مسلمانوں کی ہر طرح مدد کریں۔

مارچ ۱۹۹۹ء

دختر رسولؐ سیدہ کونین حضرت فاطمتہ الزہراءؑ

سیدہ نساء العالمین خاتون جنت دختر رسول حضرت فاطمتہ الزہراؑ تاریخ اسلام کی وہ عظیم شخصیت ہیں جنہیں خداوند عالم نے گوناگوں صفات و خصوصیات اور فضائل و کمالات سے نواز ہے۔ آپؐ کی عظمت کا اظہار آپؐ کے والد گرامی قدر حضرت پیغمبر اسلام محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت کیا جب کساء (چادر تطہیر) کے نیچے پانچ تن جمع ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل بیتؑ کا تعارف کراتے وقت ارشاد فرمایا "هم فاطمته و ابوها و بعلها و بنوها" کہ وہ (اہل بیت) فاطمہ' اس کا والد' اس کا شوہر اور اس کے بیٹے ہیں۔ کس قدر جلیل القدر بی بی تھیں کہ ان کا احترام خود حضرت پیغمبر اسلامؐ کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں روایت کے الفاظ یوں ہیں: جب حضرت فاطمتہ الزہراء تشریف لاتیں تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے ہو جاتے اور انہیں اپنی جگہ پر بٹھاتے' ان کی پیشانی کا بوسہ لیتے اور فرماتے' فاطمہ میرا ٹکڑا ہے جس نے اسے رنج دیا اس نے مجھے دیا اور جس نے اسے دوست رکھا اس نے مجھے دوست رکھا۔" (متفق علیہ عندالصحاح الستتہ)

حضرت فاطمتہ الزہراء کی تاریخ پیدائش ۲۰ جمادی الثانیہ ۵ بعثت ہے اور

آپ کی رحلت کے بارے میں مورخین نے اختلاف رائے کیا ہے۔ بعض تواریخ میں مذکور ہے کہ آپ ؑ کی رحلت ۸ ربیع الثانی ۱۱ ہجری کو ہوئی۔ بعض مؤرخین نے ۱۳/۱۴ جمادی الاولی اور بعض نے ۳ جمادی الثانیہ لکھی ہے: بہرحال آپ ؑ نے بہت کم ظاہری عمر پائی اور جتنا عرصہ زندہ رہیں' بہت کم خوشیاں دیکھیں۔ اس کے باوجود آپ ؑ نے حضرت پیغمبر اسلام ؐ کے ساتھ اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے میں کوئی کمی نہ کی۔ ہر مرحلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ساتھ رہیں اور ایک مثالی خاتون بن کر ملت اسلامیہ کی فکری تربیت کا فریضہ ادا کیا۔ مباہلہ کا میدان آپ کی عظمت ذات کا منہ بولتا ثبوت بن گیا۔ جہاں پیغمبر اسلام ؐ نجران کے نصاریٰ سے مباہلہ کی خاطر تشریف لائے تو اپنے ساتھ حضرت فاطمتہ الزہراء حضرت علی ؑ اور امام حسن ؑ و حسین ؑ کو لائے کہ جنہیں دیکھ کر نصاریٰ کے علماء و اکابرین نے کہا کہ یہ ہستیاں اگر دعا کر دیں تو پہاڑ اپنی جگہ چھوڑ جائیں۔ چنانچہ نصاریٰ نے مباہلہ نہ کیا۔ یہ مقام دراصل توحید کی گواہی کا میدان تھا جس میں اہل بیت علیہم السلام نے اپنا وجودی فریضہ ادا کیا۔

حضرت فاطمتہ الزہراء ؑ سیرت و کردار کے حوالے سے اپنا منفرد مقام رکھتی ہیں۔ آپ نے تینوں رشتے نہایت کمال فضائل کے ساتھ نبھائے اور ہر ایک حوالے سے مثال' بنیں۔ بیٹی' بیوی اور ماں سب رشتوں میں آپ منفرد مقام رکھتی تھیں۔ صنف نازک کے لیے آپ ؑ کی زندگی کا ہر پہلو درس فضیلت دیتا ہے۔ جب آپ ؑ بیٹی ہونے کے دورانیہ میں تھیں تو حضرت پیغمبر اسلام ؐ تبلیغ دین کے مقدس مشن میں مصروف تھے اور ہر طرح اور ہر طرف سے مشکلات سے دوچار تھے ان حالات میں حضرت فاطمتہ الزہراء نے اپنے والد کے ساتھ شریک مشن ہو کر اپنا پاکیزہ کردار پیش

کیا۔ ہر مشکل میں ساتھ رہیں اور جب زندگی کے دوسرے مرحلہ میں داخل ہوئیں تو مثالی بیوی بن کر اپنے شوہر نامدار حضرت علی کے ساتھ نہایت پاکیزہ ماحول میں بچوں کی تربیت' شوہر کے حقوق اور اسلام کی تبلیغ و اظہار حق کی بابت اپنا فریضہ پورا کیا' سخت ترین حالات میں تحمل و بردباری کا مظاہرہ کیا اور اپنے شوہر کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں میں ان کا سہارا بنیں۔ اگرچہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے اپنی دختر نیک اختر کے بارے میں پرزور تاکید کی تھی مگر آپؐ کی رحلت کے بعد امت نے حضرت فاطمہ کو اذیت دی۔ ان کا مسلمہ حق فدک غصب کرلیا اور آپؐ کی تکذیب کی جس کا اظہار حضرت فاطمتہ الزہراء نے اپنے بابا سے مخاطب ہوکر اس طرح کیا۔ "بابا آپ کے جانے کے بعد مجھ پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے کہ اگر دنوں پر پڑتے تو وہ سیاہ راتوں میں بدل جاتے۔" افسوس کا مقام ہے کہ سیدہ کونین اپنی نہات مختصر زندگی میں مصیبتوں اور تکلیفوں ے دوچار رہیں مگر آپؐ کی عظمت تھی کہ زبان پر اظہار شکوہ کی نوبت نہ آنے دی اور ہر لمحہ بارگاہ الٰہی میں ادائے شکر کرتی رہیں۔ حضرت فاطمتہ الزہراء نے واقعہ فدک میں حصول حق کی جدوجہد کا جو نمونہ پیش کیا اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی' عام طور پر اسے معمولی واقعہ کی صورت میں ذکر کیا جاتا ہے اور تنگ نظر مئورخین اس کی اہمیت پر پردہ ڈالنے کے لیے اس کے پس منظر' پیش نظر اور نتائج و آثار کا تذکرہ کئے بغیر اسے ذکر کر دیتے ہیں جب کہ حضرت پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے بعد امت اسلامیہ کا یہ سب سے پہلا مقدمہ تھا جس میں مدعی دختر رسولؐ' حضرت فاطمہ زہرا تھیں اور مدعا علیہ خلیفہ وقت تھا اور مقدمہ میں امام حسنؑ اور امام حسینؑ گواہ بنائے گئے تھے مگر ان سب معصوم ہستیوں کی تکذیب کر دی گئی اور حضرت فاطمہ کو ان کا حق نہ دیا گیا بلکہ اسے ضبط کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔

کاش اہل انصاف اس واقعہ پر اظہار خیال کرتے وقت سیدہ کونین حضرت فاطمہ زہراء کے بارے میں حضرت پیغمبر اسلامؐ کے ارشادات گرامی ہی یاد کر لیتے جو آپؐ نے سیدہ کی صداقت کے بارے میں فرمائے اور سیدہ کو "صدیقہ" (سچی ترین خاتون) کا لقب دیا۔ حضرت فاطمہ کی عصمت کا اظہار آیت تطہیر میں کیا گیا۔ آج خواتین عالم کو حضرت سیدہ کونین فاطمہ الزہراء کی سیرت و کردار اور عبادت و تقوی کی تقلید کرتے ہوئے مثالی خواتین بننے کی راہ اپنانی چاہیے۔ عورت پورے معاشرے کو سعادت و خوش بختی سے ہمکنار کر سکتی ہے۔ عورت حقوق کی ادائیگی میں بہترین نمونہ عمل بن سکتی ہے۔ عورت کا مقام بچوں کی تربیت کے حوالہ سے نہایت بلند ہے اسے خداوند عالم نے عظیم ذمہ داری عطاء فرمائی ہے اس کی نیک و پاکیزہ آغوش میں پرورش پانے والے بچے معاشرے کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔ حضرت فاطمہ زہراء نے اپنی زندگی میں کمالات کے ایسے پاکیزہ نمونے پیش کیے کہ ان کی روشنی میں خواتین کے علاوہ تمام افراد معاشرہ عظمتوں کے حصول کی جدوجہد میں کامیاب و کامران ہو سکتے ہیں۔ یہاں ہم ایک بار پھر سعودی حکمرانوں سے مطالبہ کرتے ہیں کہ حضرت فاطمتہ الزہراء سمیت جنت البقیع میں مدفون تمام بزرگان دین آئمہ معصومین کے مزارات مقدسہ کی تعمیر نو کی اجازت دی جائے تاکہ ان کی بارگاہ میں اظہار عقیدت کر کے ان کے توسل سے طلب عنایات الہیہ کی جائے کہ وہ ہستیاں خدا کی برگزیدہ' معصوم اور وسیلہ فیض ہیں۔

مئی ۱۹۹۷ء

آزاد و خود مختار مملکت کشمیر

کشمیر کا مسئلہ عالمی سیاسی افق پر نمودار ہونے والا نیا مسئلہ نہیں بلکہ تقسیم ہند کے بعد سے اب تک اس کے حوالے سے برصغیر پاک و ہند میں جنگ و نزاع کا ایک طوفان اٹھا ہوا ہے۔ اس کی بحرانی کیفیت میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے جس کے نتیجے میں انسانی حقوق کی پامالی معمول کا واقعہ بن چکی ہے۔ آئے دن مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جاتی ہے اب تک نجانے کتنے گھرانے تباہ ہو چکے ہیں۔ کتنے نوجوان زندگی کی نعمت سے محروم ہو چکے ہیں' کتنی عصمتیں پامال ہو چکی ہیں' کتنے سہاگ لٹ چکے ہیں اور کتنے گھروں کے چراغ گل کر دیئے گئے ہیں۔ عالمی سطح پر مسئلہ کشمیر کے حل کی تمام کوششیں بے نتیجہ ثابت ہوئی ہیں۔ پاک بھارت مذاکرات بھی اس خونی سلسلے کو نہیں روک سکے۔ جدوجہد آزادی کے لیے قائم تنظیمیں اپنی بھرپور طاقت آزمائی کر رہی ہیں مگر طوفان ہے کہ تھمنے میں نہیں آتا۔ اقوام متحدہ نے بھی قراردادیں منظور کیں مگر ان پر عملدرآمد کے لیے بھی کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ اہل کشمیر قربانیوں پر قربانیاں دے رہے ہیں۔ بھارتی حکومت اپنے مؤقف پر قائم ہے اور کشمیر کو

بھارت کا اٹوٹ انگ کہنے کے علاوہ کوئی بات سننے کو تیار نہیں۔ ادھر کشمیر بنے گا پاکستان کا نعرہ بھی پوری قوت کے ساتھ سنائی دیتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس مسئلے کا حل کیا ہے اور اس تنازع کا فیصلہ کون کرے؟۔

مسئلہ کشمیر کے تاریخی جائزہ اور موجودہ صورت حال پر عمیق نظر کرنے کے بعد اس کے علاوہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ گھمبیر مسئلہ نہ تو پاکستان اور نہ ہی بھارت حل کر سکتا ہے بلکہ یہ اہل کشمیر اور اس وادی کے باسیوں کا حق ہے کہ وہ فیصلہ کریں کہ انہیں اپنے مستقبل کے لیے کون سا راستہ اختیار کرنا ہے اور دنیا کے نقشے میں اپنا نام کہاں لکھوانا ہے۔ آیا الحاق پاکستان ان کے لیے مفید ہو گا یا آزاد و خودمختار مملکت کشمیر ان کی منزل ہے۔ کشمیری عوام اپنی تقدیر کا فیصلہ خود کریں اور اپنا حق خود ارادیت استعمال کرتے ہوئے ہندوستان' پاکستان یا آزاد ریاست میں سے کسی ایک کو اختیار کریں۔ اس سلسلے میں اہل کشمیر کی اکثریت کا فیصلہ ہی مسئلہ کا اصل حل ہے اور ان کے اکثریتی فیصلے کو پاک و ہند سمیت دنیا کی ہر قوم بخوشی تسلیم کرے کیونکہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جب دوسرے ممالک کسی قوم کے بارے میں فیصلہ کرنے لگیں تو اس فیصلہ کو اس قوم کی بہتری و صلاح کا ضامن نہیں کہا جا سکتا۔ بھارت جدوجہد آزادی کو طاقت کے ذریعے کچلنے کی بجائے کشمیریوں کے جذبات کا احترام کرے تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اسی طرح پاکستان عالمی سطح پر صرف یہی آواز بلند کرے کہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق اہل کشمیر کو اپنی تقدیر کا فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے۔

عالمی حالات کے تناظر میں امریکہ جس طرح پوری دنیا پر قبضہ جمانے کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنا چاہتا ہے اس سے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ

کشمیر پر بھی وہ اپنی مرضی ٹھونسنے سے باز نہ آئے گا مگر اس کا نتیجہ کشمیری عوام کی بجائے امریکی مفادات کے تحفظ کی صورت میں امریکہ کے حق میں جائے گا۔

بہرحال اس سے قطع نظر جمہوری' عالمی' انسانی اور علاقائی اصولوں و حقوق کی روشنی میں میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ کشمیر کا مسئلہ کشمیری عوام سے تعلق رکھتا ہے وہی اپنے بارے میں فیصلہ کا حق رکھتے ہیں۔ موجودہ ترقی یافتہ دور میں بھی انسانی حقوق کی پاسداری نہ کی گئی تو کب کی جائے گی۔ یہ زمانہ جمہوریت کا زمانہ ہے' سلطانی جمہور کے اس دور میں اگر کوئی قوم اپنے مستقبل کا فیصلہ خود نہ کر سکے تو یہ کس قدر ناانصافی ہوگی۔

وادی کشمیر اپنے قدرتی جمال کے باوجود آگ و خون کا دریا بنی ہوئی ہے۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۶ء سے اب تک ۶۵۴۵ کشمیریوں کو موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے۔ اس دوران ۸۰۸ کشمیری زیر حراست مارے گئے۔ ۱۸۹۸ گھر تباہ ہوئے' ۱۶۷ خواتین کی کھلم کھلا عزت پامال کی گئی' ہزاروں افراد تشدد کا شکار ہوئے' ۱۹۹۹ء کی آخری سہ ماہی میں ۹۱۹ شہری اور دوران حراست ۸۲ کشمیری ہلاک کر دیئے گئے' ۲۹۰ گھر تباہ اور ۳۴ خواتین کی عزت لوٹی گئی۔

یہ وہ فہرست ہے جو حریت کانفرنس کے اعلامیہ سے ظاہر ہوتی ہے اس کے علاوہ کتنے جرائم ہوئے اور کتنی معصوم جانیں ضائع ہوئیں۔ اس کا علم خدا کو ہے تو انسانیت کشی کے اس بازار کی بندش کے لیے عالم اسلام اور انسانی اداروں سمیت دیگر قوتوں کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

میری نظر میں مسئلہ کشمیر کا واحد حل یہی ہے کہ وہاں کے عوام کی اکثریت کو اپنے بارے میں فیصلہ کا مکمل اختیار (جو کہ فطرتاً انہیں حاصل ہے)

استعمال کرنے دیا جائے اور پاک و ہند سمیت تمام ممالک ان کے اکثریتی فیصلے کو تسلیم کرکے ان کی حمایت و مدد کریں کہ یہی اصل جمہوری تقاضا اور انسانی فیصلہ ہے۔

دسمبر ۱۹۹۹ء

ایران اور سعودی عرب کے سیاسی روابط پر ایک نظر

ایران خطہ میں جس اہمیت کا حامل ہے اس سے انکار ممکن نہیں اسی طرح سعودی عرب کئی حوالوں سے اپنا منفرد مقام رکھتا ہے۔ مقدس مقامات اور تیل و قدرتی ذخائر سے مالا مال یہ مملکت دنیا میں اپنا تشخص رکھتی ہے۔ دونوں ممالک میں نظریاتی اختلافات کی وجہ سے کئی مرتبہ جنگ کی سی صورت حال پیدا ہوئی اور سیاسی حوالہ سے بھی ایران میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد حج کے دوران مظاہروں اور پھر ان مظاہرین پر اندھا دھند گولیاں برسانے کے نتیجے میں سینکڑوں حجاج کرام کی شہادت نے ان دونوں ملکوں کو ایک دوسرے سے بہت دور کر دیا مگر اب صورت حال میں قدرے فرق پیدا ہوا ہے اور دونوں ملکوں نے تعلقات کی بہتری و بہبود کے لیے اقدامات کرنے شروع کر دیئے ہیں۔

یہ بات کس قدر افسوس ناک ہے کہ مسلمانوں کے درمیان صدیوں سے اختلافات کی ایک آگ لگی ہوئی ہے اور ابھی تک ان کے مستقل حل کی کوئی صورت سامنے نہیں آئی جتنی کوششیں اس سلسلے میں ہوتی ہیں' وہ سب عارضی و ناپائیدار ثابت ہوتی ہیں۔ مسلمان ممالک کے حکمرانوں میں قدامت

پسندی اور جدیدیت کے نظریات کے اثر سے اشتراک عمل کی صورت اور اتحاد کی عملی شکل نظر نہیں آتی کیونکہ ان حکام کے درمیان جو بنیادی فرق پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اقتدار پر فائز یا قابض شخصیات یا خاندان جمہوریت اور شورائیت کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں جب کہ دوسرے نظریہ کے افراد شخصی آمریت و حاکمیت کو ناقابل قبول بلکہ ناقابل عمل سمجھتے ہیں۔

ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد اس کے اور خلیجی ممالک کے درمیان اختلافات' تلخی و کشیدگی کی ایک نئی لہر آئی' انقلاب سے قبل ایران کا جھکاؤ امریکہ کی طرف تھا اور اس غیر معمولی جھکاؤ کی وجہ امریکہ کے دیگر حلیفوں سے بھی ایران کے تعلقات بہتر تھے' ان میں سعودی عرب سرفہرست تھا۔ خلیجی ریاستوں میں بھی کم و بیش یہی صورت حال تھی اور اگر کبھی معمولی سی رنجش اور دریائی حدود کی وجہ سے اختلافات سامنے آتے تھے تو ان پر اس قدر سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود ایران اور خلیجی عرب ریاستوں کے درمیان تنازعات کی اصل وجہ ایک دوسرے پر برتری پانے کا جذبہ تھا اور علاقائی طور پر سیاسی قوت کے حوالہ سے اپنے استحکام کا ثبوت فراہم کرنا تھا کہ جن میں نظریاتی و اعتقادی امور کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر تھا۔ اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد عرب ممالک اور ایران کے درمیان کشیدگی کی وجہ سے یہ تھی کہ ان ممالک میں بالعموم شخصی حاکمیت یا خاندانی اقتدار پایا جاتا ہے لہٰذا ان حکومتوں کو اس بات کا خطرہ لاحق ہوگیا کہ ایران میں شخصی آمریت اور ہزاروں سالہ سلطنت کے خاتمہ کے بعد انقلاب کی جو لہر اٹھی ہے وہ کہیں ان کی حکومتوں کو اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔ ادھر امریکہ کے اثر و رسوخ کی وجہ سے بھی خلیج کی ریاستیں اور

سعودی عرب کی حکومت ایران کے انقلاب کے اثرات ختم یا کم کرنے کے درپے تھی لہٰذا ان کے درمیان مفاہمت اور باہمی روابط حسنہ کا قیام مشکل تھا۔

ایران اور عرب ممالک بالخصوص سعودی عرب کے درمیان مفاہمتی عمل اس وقت شدید متاثر ہوا' جب امریکہ نے عراق کے ذریعے ایران پر جنگ مسلط کر دی' اس طویل جنگ میں عرب ملکوں نے نظریاتی و سیاسی دونوں اسباب کے پیش نظر عراق کا ساتھ دیا مالی امداد دی' اخلاقی تعاون کیا' سیاسی حمایت کی اور ہر لحاظ سے عراق کو ایران پر فتح پانے کی راہیں ہموار کیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس طولانی جنگ میں ان ممالک کے مقاصد پورے طور پر حاصل نہ ہو سکے تاہم خطے میں کشیدگی میں اضافہ ہوا۔

ایران اور عراق کے درمیان تباہ کن جنگ کے دوران عرب ممالک کی دولت اور قدرتی وسائل و ذخائر کو زبردست تباہی کا سامنا ہوا چنانچہ جنگ کا طویل ہونا ایک لحاظ سے ان ممالک کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا مگر امریکہ کے لیے مفید واقع ہوا کیونکہ اقتصادی و سیاسی اعتبار سے ان کمزور عرب ممالک کا امریکہ پر انحصار بڑھ گیا۔ ابھی ایران کے ساتھ جنگ کے اثرات عراق سے ختم نہیں ہوئے تھے کہ امریکی سازشوں کا شکار بعثی حکومت نے کویت کا رخ کرلیا اور امریکہ جو کہ بظاہر عربوں کا حامی اور کویت کا مددگار بنا مگر درپردہ اس کا منصوبہ اس لیے بھی کامیاب ہوا کہ اس نے کویت میں اپنی فوجی چھاؤنی قائم کر دی۔ امریکی فوج نے کویت سے عراق کو نکالنے کے بہانے پر کویت کی ساری ثروت پر ہاتھ صاف کیا اور بالاخر صدام کو بظاہر پسپا کر کے کویت و دیگر عرب ریاستوں میں اپنے اثر و رسوخ کو مستحکم کرلیا۔ صدام حسین جو کہ بلاشبہ ایک امریکی ایجنٹ ہے اور

اس کے ذریعے امریکہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے منوبہ بندی کرتا ہے۔ اس نے عرب ریاستوں اور سعودی حکمرانوں کو بھی آنکھیں دکھانا شروع کر دیں۔ عرب ممالک ہرگز اس قدر تیز بین نہ تھے کہ معاملات کی باریکیوں کا ادراک کرتے۔ انہوں نے اپنے ہی حمایت یافتہ شخص کی ان حرکتوں پر تعجب کیا اور خلیجی تعاون کی تنظیم حرکت میں گئی جو کہ امریکہ کے حق میں تھی تو ظاہر ہے کہ امریکہ درپردہ صدام کو آلہ کار بناکر عرب ریاستوں میں اپنا اثر و رسوخ مضبوط کرنے کے درپے تھا اور ظاہر بظاہر صدام کی مخالفت کرکے عربوں کو خوش کر رہا تھا لہٰذا عربوں نے اپنی تمام تر ثروت اور سیاسی قوت امریکہ کی جھولی میں ڈال دی۔ جس کے نتیجے میں امریکہ انقلاب سے پہلے والے ایران سے محروم ہونے کے بعد عربوں میں اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے منصوبہ بندی کرنے لگا۔ عربوں نے بالاخر طولانی اختلافات کے بعد ایک بار پھر ایران کے ساتھ بہتر تعلقات استوار کرنے کا سوچا۔ اس میں خلیجی ممالک کے دانشوروں کا عمل دخل تھا یا پھر امریکی سازش کا کوئی پہلو اس سلسلے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے مگر جو بات اس وقت زیر بحث ہے وہ یہ کہ خلیجی ممالک بالخصوص سعودی عرب نے ایران کے ساتھ اپنے تعلقات بہتر بنانے کا عملی اقدام کیا۔

اگرچہ ایران کے ساتھ عراق کی آٹھ سالہ طویل جنگ کے اثرات اتنی جلدی ختم نہیں ہو سکتے لیکن خطہ میں قیام امن کے لیے کوشش بھی ناگزیر ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ خلیج کی جنگ میں ایران نے متحارب ممالک میں سے کسی کی بھی مدد نہیں کی تاہم اس کے باوجود ایران نے اس لیے بھی عراق کے لیے نرم گوشہ رکھا ہوا تھا کہ دوسری حکومتوں نے اسے ایران کے خلاف

استعمال کیا اور اب خود اس کے ہاتھوں پٹ رہی تھیں لہٰذا سیاسی حوالہ سے بھی عراق کی قدرے حمایت ان ممالک کو سبق سکھانے میں مئوثر ثابت ہو سکتی تھی تاہم ایران نے نہایت محتاط طریقے سے عراق اور عربوں کی

کشیدگی میں حصہ لیا۔

ایران اور عرب ممالک بالخصوص سعودی عرب کے درمیان تعلقات کی بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی اور دن بہ دن غیر واضح سیاسی صورت حال پیدا ہو رہی تھی کہ مئی ۹۷ء میں ایران میں حکومتی تبدیلی نے اس میں کردار ادا کیا۔ ایران میں اعتدال پسند حکومت قائم ہوتے ہی عربوں نے تعلقات کی بہتری کے لیے اقدامات کرنے کو غنیمت جانا۔ ایرانی حکومت کے صدر سید محمد خاتمی اپنی معتدل خارجہ پالیسی کے حوالے سے شہرت رکھنے کی وجہ سے عربوں کے درمیان امید کی کرن بن گئے۔ انہوں نے امریکہ سے تعلقات کی بہتری، بابائے روم سے روابط حسنہ کے قیام تک کی بات کی اور دنیائے عرب کے دو بڑے گروپ کہ جن میں مغرب نواز اور مغرب مخالف شامل ہیں، سے بھی تعلقات معمول پر لانے کا عندیہ دیا۔ اس سلسلے میں ان کی کاوشوں کا نقطہ عروج ان کا چار روزہ سعودی عرب کا دورہ تھا جس میں وہاں کے فرمانروا اور ولی عہد و دیگر اعلیٰ حکام نے انہیں سینے سے لگایا اور گلے شکوے کی بجائے مستقبل کی بہتر صورت اور باہمی تعلقات کی بہتری کے لیے گفتگو اور مذاکرات کئے۔ چنانچہ شاہ فہد اور صدر خاتمی کے درمیان ہونے والے مذاکرات کے بعد فریقین کے مئوقف میں تبدیلی کا جو اظہار سامنے آیا اسے عالم اسلام کے لیے نیک فال قرار دیا گیا اگرچہ مکمل مفاہمت و مصالحت و دوستی کے لیے طویل جدوجہد کی ضرورت

ہے۔ ایران اور سعودی عرب کے درمیان باہمی روابط بہتر بنانے کا جو سلسلہ شروع ہو چکا ہے اس سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اب دیگر عرب ریاستوں سے بھی ایرانی تعلقات کی بہتری کا راستہ ہموار ہو جائے گا لیکن جو اہم بات اس سلسلے میں کرنے کی ہے وہ یہ کہ ایران و سعودی عرب تعلقات کی بہتری کی صورت میں اس امر کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ کہیں امریکہ ایک بار پھر اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر کر اپنے شیطانی جرائم کی تکمیل میں کچھ کر سکتا ہے کیونکہ ایران کے اسلامی انقلاب کا جتنا نقصان امریکہ کو ہوا ہے، کسی دوسرے کو نہیں ہوا اور سعودی عرب تو پہلے ہی امریکی بلاک کا مئوثر عرب رکن سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا ان تعلقات سے اس کا فائدہ اٹھانا اور اپنے مفادات کا تحفظ کرنا غیر متوقع قرار نہیں دیا جا سکتا تاہم میری نظر میں ایران اور عرب ملکوں بالخصوص سعودی عرب کے درمیان بہتر تعلقات فریقین کے لیے مفید ہیں۔

نومبر ۱۹۹۹ء

۱۴ اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء

پاک و ہند کی آزادی کے حوالے سے ۱۴ اور ۱۵ اگست نہایت اہمیت کے حامل دن ہیں۔ ان دنوں میں دونوں ممالک ہر سال جشن آزادی مناتے ہیں کیونکہ وہ دونوں برطانوی سامراج سے چھٹکارا پانے کی یاد میں اپنی تاریخ کے ان اہم ترین دنوں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

حصول آزادی انسان کی سب سے بڑی فطری خواہش ہوتی ہے اور ہر قوم اس مقصد کے لیے جدوجہد کرتی ہے' قربانیاں دیتی ہے اور بالاخر ایک دن آتا ہے جب وہ اپنے آپ کو غلامی سے آزاد محسوس کرتی ہے۔

تقسیم ہند کے وقت جس طرح جغرافیائی و علاقائی حوالے ملحوظ رکھے گئے ان کا خمیازہ آج تک دونوں ملک بھگت رہے ہیں۔ برطانوی سامراج سے پاک و ہند کی آزادی یقیناً" دونوں اقوام کے لیے نہایت اہم حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اس سے پہلے ان کا کوئی قومی و ملی تشخص نہ تھا بلکہ وہ برطانوی کالونی کہلاتے تھے لیکن انگریزوں نے تقسیم ہند کے فیصلے کے ساتھ جب ان ملکوں کو آزادی دینے کا فیصلہ کیا تو اپنی شیطانی سوچ کے مطابق ایسی تقسیم کردی کہ اب

یہ دونوں اسی تقسیم کے حوالے سے آپس میں نبرد آزما رہتے ہیں۔ کشمیر کے حوالے سے دونوں ملکوں کے درمیان دو خونریز جنگیں بھی ہو چکی ہیں۔ ایک بلاواسطہ اور دوسری بالواسطہ۔ بلاواسطہ جنگ میں پاکستان کو برتری حاصل رہی اور بالواسطہ جنگ میں ہندوستان نے مشرقی پاکستان کی حمایت کرتے ہوئے بنگلہ دیش بنوادیا۔ بالاخر برطانیہ سے آزادی حاصل کرنے کے بعد دونوں ممالک مستقل طور پر ایک دوسرے کے حریف بن گئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ سیاسی اختلافات کے باعث ان ممالک کے باسیوں کے درمیان فکری و عملی دوری پیدا ہو گئی اور باہمی روابط حسنہ کے قیام ایک خواب بن گیا اعتقادی و نظریاتی حوالوں سے جو فرق ان دونوں ملکوں کے درمیان پایا جاتا ہے اس کا اثر سیاسی و سماجی روابط پر اس طرح پڑا کہ دونوں ملک دو مختلف سیاسی بلاکوں کے غلام بن کر رہ گئے۔ برطانوی سامراج سے آزادی تو حاصل ہو گئی اور انگریزوں سے چھٹکارا پانے کی جدوجہد کامیابی سے ہمکنار ہوئی مگر ہندوستان میں روسی اور پاکستان میں امریکی سامراجیت کے جھنڈے گڑ گئے۔ سیاسی و عسکری حوالوں سے ان دو سپر طاقتوں نے پاک و ہند کے قدرتی ذخائر اور افرادی قوتوں سے اپنے مفادات کا تحفظ کیا اور اب تک کر رہے ہیں۔

کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ دونوں ہمسایہ ممالک اپنی مشترکہ علاقائی تہذیبوں کے باوجود اپنی تمام تر توانائیاں ایک دوسرے کے خلاف صرف کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اسی تناظر میں دونوں ملک ایٹمی دھماکے بھی کر چکے ہیں اور ایک دوسرے پر برتری کا اظہار بھی کر چکے ہیں اور ہمیشہ ہی کرتے رہتے ہیں لیکن سوچنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ دونوں ملکوں کے عوام نے

برطانوی سامراج سے آزادی حاصل کرنے میں جو مقصد متعین کیا تھا وہ پورا ہو چکا ہے اور اب ایک دوسرے کے خلاف طاقت آزمائی باقی ہے؟۔ آیا اس وقت دونوں ممالک اپنی اقتصادی مشکلات پر قابو پانے میں کامیاب ہو چکے ہیں جب کہ یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ دونوں ممالک مقروض ہیں اور بیرونی امداد اور قرضوں پر گزارا کر رہے ہیں۔ فقر و ناداری کا سیلاب دونوں ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے۔ ہندوستان میں نجانے کتنے لوگ بھوک کی وجہ سے لقمہ اجل بن چکے ہیں اور ہر سال مرتب کی جانے والی رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ غربت دونوں ملکوں پر چھائی ہوئی ہے' پاکستان میں بھی افلاس سے تنگ آکر لوگ خودکشی پر مجبور ہوئے ہیں چنانچہ ۱۹۹۸ء کے آخری مہینوں اور ۱۹۹۹ء کے ابتدائی مہینوں میں خودکشی کے واقعات نے ملک میں خوف و ہراس پھیلا دیا ہے تو ایسی صورت میں دونوں ممالک کا ایٹمی دھماکے کرنااور عالمی سطح پر ایک دوسرے کے خلاف برتری کا اظہار کرنا بے معنی اور اپنے آپ سے مذاق کرنے کے برابر ہے۔ دونوں ممالک کے سالانہ بجٹ کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے درمیان مفاہمت کا کوئی امکان ہی نہیں پایا جاتا کیونکہ دفاعی اخراجات پر اربوں روپے کا اختصاص کیا معنی رکھتا ہے۔ اس کثیر رقم کو عوام کی فلاح و بہبود پر کیوں خرچ نہیں کیا جاتا۔ دونوں ملک علاقائی امن و سلامتی کے کسی مشترکہ فارمولے پر عمل کیوں نہیں کرتے؟۔

حقیقت یہ ہے کہ برطانوی سامراج سے آزادی کا فائدہ اتنا نہیں ہوا جتنا امریکی و روسی سامراج کی غلامی سے نقصان اٹھانا پڑا۔ دونوں ملکوں نے آزادی کی قدر نہیں کی اور اس کے تقاضے پورے نہیں کئے اسی لیے بھی تک بڑی طاقتوں

کے زیر اثر ہیں جب کہ آزادی کے بعد استقلال ضروری تھا۔ کسی سے وابستگی ان کے مفاد میں نہیں اس لیے میں ان ملکوں کے حکمرانوں اور عوام سے یہی کہوں گا کہ اپنی آزادی کی قدر کریں۔ ہر قسم کی غلامی کی زنجیروں کو توڑ دیں۔ اپنے استقلال کے ساتھ اپنا نام روشن کریں اور اپنی توانائیوں اور وسائل کو بروئے کار لاکر تاریخ میں اپنا تشخص قائم کریں۔ اپنے مشترکہ مفادات کو دوسری اقوام کے مفادات پر ترجیح دیں۔ اپنی تاریخی روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب ہوں' اعتقادی و نظریاتی اعتبار سے اپنی آزادی کا حق محفوظ رکھیں لیکن سیاسی و سماجی' اقتصادی و معاشرتی اور علاقائی حوالوں سے اچھے ہمسایوں کی طرح رہیں۔ مسئلہ کشمیر کو ہمیشہ کے اختلاف کی وجہ نہ بنائیں بلکہ اب وقت آگیا ہے کہ عصری تقاضوں کے مطابق اہل کشمیر کو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا موقع دیں جو کہ ان کا انسانی حق ہے۔ دونوں ممالک کشمیر کو مضبوط بنانے اور اس اقتصادی استحکام کے لیے اس کی بھرپور مدد کریں۔ اس پر اپنی مخصوص آراء و نظریات اور سیاسی خطوط مسلط نہ

کریں۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ پاک و ہند کا باہمی قرب علاقائی استحکام کی ضمانت دے سکتا ہے ورنہ تاریخ میں یہ سوال ہمیشہ باقی رہے گا کہ دونوں ممالک نے آزادی کیوں حاصل کی اور اتنی بڑی جدوجہد و قربانیوں کا مقصد کیا تھا؟۔ ایک سامراج سے آزادی حاصل کرنے کے بعد دوسرے سامراج کی غلامی اختیار کرنا حقیقی معنی میں آزادی نہیں کہلا سکتا۔ ۱۴ اور ۱۵ اگست کو آزادی کی بقا' استقلال کے حصول اور ملکی امن و سلامتی اور استحکام کی تجدید عہد کا دن قرار دیں۔ اگر یہ سب کچھ ہو جائے تو یقیناً" آزادی کے حصول کی

کوششیں لائق ستائش ہوں گی اور اس کے حصول کے بعد استقلال کے ساتھ اپنے مسائل حل کرنا قومی و ملی وقار کو بلند کرنے کا سبب بنے گا۔ دونوں ممالک کے عوام اور حکومتوں کا فرض ہے کہ اپنی علمی و افرادی قوتوں کو اپنے ہی مسائل کے لیے استعمال میں لائیں تاکہ کوئی دوسرا ان کا استحصال نہ کر سکے۔

اگست ۱۹۹۸ء

مسلمان کب بیدار ہوں گے؟

دنیا بھر میں اہل اسلام جس طرح انسانی حقوق کے نام نہاد علمبرداروں کے ظلم و استبداد کے شکار ہیں' وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ البانیہ' بوسنیا' کشمیر اور دیگر علاقوں میں انسانیت کشی اپنے عروج پر ہے۔ ہر طرح کا اسلحہ اور تباہ کن ہتھیار استعمال کیے جا رہے ہیں۔ یہ سب مہلک ہتھیار کس نے بنائے ہیں؟۔ کیوں بنائے ہیں اور انسانی حقوق کے تحفظ کے کس جذبہ کے تحت بنائے ہیں؟۔ کوسوو پر ہونے والی بربریت و دہشت گردی کے سانحے ٹیلی ویژن پر دیکھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے اس دنیا میں کوئی انسان نہیں رہتا' سینکڑوں انسانی لاشوں کے اجتماعی گڑھے دریافت ہوئے ان جرائم میں ملوث حکومتیں عالمی سطح پر دندناتی پھرتی ہیں۔ بین الاقوامی حلقوں میں ان کی شمولیت کما فی السابق موجود ہے اور نیٹو کی طرف سے ظاہری اقدامات کے نتیجے میں سرب درندوں نے کوسوو کو چھوڑ دیا ہے اور وہاں کے ستمدیدہ مظلوم افراد اپنے خالی گھروں' اجڑے ہوئے دیار میں واپس جا رہے ہیں کہ جہاں ان کے اپنوں' دوستوں' عزیزوں اور قریبیوں کی لاشوں سے بھری اجتماعی قبروں کے سوا کچھ باقی نہیں بچا۔ اس سے قبل بوسنیا میں

جو کچھ ہوا وہ ساری دنیا میں دیکھا گیا۔ کشمیر میں خوں ریزی کا بازار گرم ہے اور آئے دن بے گناہ شہریوں کے قتل کی خبریں آتی ہیں۔ عراق میں بڑی طاقتوں کی جارحیت کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ کسی نہ کسی شکل میں نام نہاد سپر پاورز وہاں اپنے استبدادی سلسلے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ عالمی انسانی حقوق کی تنظیمیں ان کاروائیوں پر زبانی احتجاج کی حد سے زیادہ کچھ نہیں کر رہیں۔ کون نہیں جانتا کہ یہ سب کچھ صرف اور صرف مسلمانوں اور کلمہ پڑھنے والوں کے خلاف امریکی ورلڈ آرڈر کا حصہ ہے۔ مسلمان ممالک میں امریکی اثر و رسوخ میں اس قدر اضافہ ہو چکا ہے کہ اب کوئی حکمران اپنے خلاف ہونے والی ظالمانہ کاروائیوں پر صدائے احتجاج بلند کرنے کی جرات نہیں کرتا اور ہر اہم فیصلہ امریکی مشوروں سے کیا جاتا ہے۔ ادھر مسلمانوں کے اندرونی مسائل اس قدر خرابیوں سے دوچار ہیں کہ ہر ملک میں اخلاقی جرائم حد سے بڑھ چکے ہیں۔ فرقہ واریت اور سیاسی عداوتیں قومی سلامتی اور ملت اسلامیہ کے وقار و استحکام کو تباہ کر رہی ہیں۔ پاکستان، ہندوستان، افغانستان یہ تینوں ممالک "اسلامی جمہوریہ" کہلاتے ہیں۔ مگر ان میں سیاسی اختلاف نے جو صورت حال پیدا کی ہوئی ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں، سیاسی جماعتوں نے ایک دوسرے کے خلاف زہر افشانی کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے اس کے نتیجے میں ملکی و قومی وسائل تباہ ہو رہے ہیں۔ تعلیمی و اقتصادی ترقی رک گئی ہے اور عالمی سطح پر جگ ہنسائی کے اسباب فراہم ہو چکے ہیں، گویا ملت اسلامیہ اندرونی اور بیرونی دونوں محاذوں پر اپنوں اور غیروں کے ہاتھوں تباہی کا شکار ہے۔ عظیم قدرتی ذخائر کے باوجود غیر ملکی قرضوں پر بجٹ کے خسارے پورے کئے جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ سلسلہ کب تک جاری رہے

گا؟۔ آخر ملت اسلامیہ اپنی عظمت رفتہ کی بحالی کے لیے کب اقدام کرے گی؟۔ اپنے نوجوانوں کو مغربی شیطانی تہذیب و تمدن کے تباہ آثار سے بچانے کے لیے اپنے وسائل کیوں استعمال نہیں کئے جاتے؟۔ افسوس کا مقام ہے کہ مسلمان حکمران عیاشیوں' مکاریوں اور اقتدار کو طول دینے کے لیے قومی و مذہبی معیاروں کو پامال کرکے دشمنان اسلام کے مفادات کا تحفظ کرنے میں مشغول ہیں۔ عرب ممالک کے سربراہ امریکی غلامی کا طوق گلے میں ڈال چکے ہیں اور نشہ اقتدار میں مست ہر طرح کی معصیت کا ارتکاب کرنے میں منہمک ہیں۔ سعودی عرب کہ جہاں خانہ خدا اور قبر رسول ؐ جیسے عظیم مقدس مقامات ہیں وہاں مخصوص مسلک کے حکمران بزرگان دین کے آثار محو کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور دنیا میں کسی احتجاج یا مطالبہ پر کان دھرنے کو تیار نہیں۔ جنت البقیع' جنت المعلی اور قبر حضرت آمنہ و دیگر بزرگان دین کے مزارات منہدم کرکے نجانے وہ لوگ تاریخ میں اپنے نام کون سا کارنامہ لکھوانا چاہتے ہیں۔ بھارت میں بابری مسجد کو شہید کرنے والی ہندو جماعت کے برسر اقتدار آنے کے بعد اس سانحہ پر خاموشی عالمی سطح پر مسلمانوں کی اپنے مقدسات سے لاپرواہی کا ثبوت ہے۔ آخر مسلمان کب بیدار ہوں گے اور اپنے دشمنوں کے مفادات کا تحفظ کرنے کی بجائے اپنے دینی و قومی مفادات کو تحفظ دیں گے؟۔ ہم تمام ارباب دانش و صاحبان اقتدار مسلمان بھائیوں کو دعوت فکر دیتے ہوئے ان تمام مسائل کے حل کے لیے ضروری اقدامات کرنے کی تاکید کرتے ہیں اور دانش وروں' صحافیوں' ادیبوں اور اہل قلم حضرات سے توقع کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں اپنی نگارشات کے ذریعے مسلمانان عالم کو خواب غفلت سے بیدار ہونے کی راہ میں دکھائیں گے اور ملت اسلامیہ

کے حقوق کی بحالی اور عالمی سطح پر ان پر ہونے والے مظالم پر صدائے احتجاج بلند کرکے انسانی حقوق کی عالمی تنظیموں کے ممبر ممالک کے ضمیروں کو جھنجوڑیں گے۔

مارچ ۱۹۹۸ء

ظہور نورؐ

☆ دنیائے بشریت پر جہل و کفر کی تاریکی محیط تھی۔

☆ انسانیت کے بدن پر لباس شرافت نہ تھا۔

☆ ابن آدم اپنی تخلیق کے مقصد اعلیٰ کو بھلا چکا تھا۔

☆ وحشت و بربریت نے فطرت کی پاکیزہ قدروں کو پامال کر دیا تھا۔

☆ کسی کو ماضی کے عبرت ناک واقعات یاد نہ تھے۔

☆ گزری ہوئی اقوام پر نازل ہونے والے عذاب کے اسباب سے توجہ ہٹ گئی تھی۔

☆ انسان اپنے ہی ہاتھوں انسانیت کا قتل عام کر رہا تھا۔

☆ صنف نازک کا وجود بار گراں سمجھا جاتا تھا یہاں تک کہ اپنے ہی گھر جنم لینے والی بچیوں کو زندہ درگور کر دینا عرب معاشرے کا دستور عام بن چکا تھا اور اس سے بالاتر یہ کہ اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بتوں کی پوجا کرنا اپنے لیے وجہ افتخار سمجھتے تھے۔

☆ ایسے حالات میں خدا کے آخری نبی نے ظہور کیا اور دنیا والوں کی

غلط و بے ہودہ رسموں اور باطل عقائد و نظریات کو چیلنج کرتا ہوا آیا۔

☆ ۱۷ ربیع الاول عام الفیل کو تاریخ نے کروٹ بدلی۔

☆ محمد بن عبداللہ پیدا ہوئے۔

☆ ان کی ولادت سے انسانیت کے مردہ جسم میں روح تازہ آگئی۔ دکھی آدمیت نے سکھ کی سانس لی اور بت پرست معاشرے کے درد بام پر توحید کا پرچم لہرائے جانے کی نوید مل گئی۔ جہالت و جاہلیت کی تاریکی میں ڈوبی ہوئی قوم کو علم و آگاہی کی روشنی نصیب ہوئی اور شرک کی نجاست سے آلودہ معاشرے کو توحید کی پاکیزہ و مغفرت حاصل ہوئی۔

☆ کون جانتا تھا کہ ایک یتیم کہ جس نے دنیا میں آکر اپنے حقیقی باپ کی شفقت نہ پائی وہ پوری کائنات کو گمراہی سے نجات دلاکر حقیقی شفیق رہنما کی طرح نشان منزل بتائے گا۔

☆ کسے خبر تھی کہ مکہ کی سرزمین میں ظہور پذیر ہونے والا شخص پوری دنیا پر نظریاتی حکمرانی کرے گا مگر سب نے دیکھا اور حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ پیغمبر اسلامؐ نے اپنی صداقت و امانت داری کا کلمہ عرب کے ضدی لوگوں سے پڑھوایا اور ایک خدا کی عبادت کا اعلان کرکے اس شہر کو جو بت پرستی کا مرکز بنا ہوا تھا۔ توحید کا محور بنا دیا' یہ سب محمد مصطفیٰ کے مقدس وجود کی برکت تھی کہ دنیا خدا پرست انسانیت شناس بن گئی' آپ کے نور کی

برکت سے کائنات میں نور ہے اور آپ ؐ کے وجود سے کائنات کو وجود کی نعمت ملی۔

بمناسبت میلاد النبی ؐ ۱۹۹۷ء

حضور عابدؑ

چوتھے تاجدار امامت حضرت امام زین العابدین کی ولادت باسعادت کے بارے میں ایک روایت یہ ہے کہ آپ ۱۵ جمادی الاولی میں پیدا ہوئے جب کہ دوسری روایت ۵ شعبان ۳۸ ہجری کی ہے' آپ اپنی دیگر خصوصیات کے علاوہ عبادت و دعا کے حوالے سے زین العابدین کہلاتے ہیں۔ آپؑ کی حیات طیبہ پاکیزہ اقدار کا مجموعہ تھی۔ آپ نے واقعہ کربلا میں تمام حالات کا مشاہدہ کیا اور حضرت امام حسینؑ کے عظیم جہاد کے تحفظ میں بنیادی کردار ادا کیا۔ آپ نے اپنی پر برکت زندگی میں علوم و معارف کی تعلیم دعا کے ذریعے دی اور معروف سائنس دان نیوٹن کے قوت جاذبہ کے کشف سے صدیوں قبل روشنی اور ہوا کے وزن کا اشارہ دیا چنانچہ ایک دعا میں آپؑ نے فرمایا:

اے میرے پروردگار! تیری ذات پاک ہے تو آسمانوں اور زمین کے وزن کو آفتاب و ماہتاب کے وزن کو ظلمت و نور کے وزن کو اور سایہ و ہوا کے وزن کو جانتا ہے -----

دعائیہ کلمات میں ایک عظیم علمی انکشاف کرکے آپؑ نے یہ ثابت کر

دیا کہ آپؑ کا علم عطائے ربانی ہے، کسبی نہیں، اسی طرح حقوق انسانی کے بارے میں آپؑ کا رسالۃ الحقوق مشہور ہے جس میں تمام حقوق کا ذکر ہے کون جانتا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا جب دنیا انسانی حقوق کے نام پر ادارے اور عالمی تنظیمیں قائم کرے گی۔ چنانچہ اقوام متحدہ نے دوسری جنگ عظیم کے دوران پچاس ملین افراد کی ہلاکت کے بعد دنیا کے ۵۶ مختلف ملکوں کی مشارکت سے ۸۶ اجلاس منعقد کر کے سات سو دنوں میں ہزاروں گھنٹے مسلسل کام میں مشغول رہ کر ۳۰ دفعات پر مشتمل انسانی حقوق کا عالمی منشور مرتب کیا مگر اب تک اس پر طرح طرح کے اعتراضات ہوتے ہیں اور ان کے تحفظ کا نعرہ عملی صورت نہیں لے سکا جب کہ امام زین العابدینؑ نے تمام حقوق کو ایک ہی نشست میں ۵۰ دفعات کے ضمن میں بیان کر دیا کہ جن کے تحفظ کا ضامن ایمان و تقوائے الٰہی ہے۔ امام زین العابدین علی بن الحسینؑ کثرت سجدہ گزاری کے حوالے سے "سجاد" کہلائے۔ آپؑ کی ولادت کی مناسبت سے آپؑ کی حیات طیبہ کے ہر پہلو کا تذکرہ ہدایت کی روشنی عطاء کرتا ہے۔ ہمارا سلام ہو آپؑ پر اور آپؑ کی اولاد طیبہ پر۔

(بمناسبت ولادت امام زین العابدینؑ ۱۹۹۷)

طلوع صادق

حضرت صادق آل محمد امام جعفر صادقؑ کی ولادت ۱۷ ربیع الاول ۸۳ ہجری کو ہوئی' اس وقت علوم و معارف کا چرچہ تھا۔ آپ نے علم امامت کے ساتھ ایک عظیم درس گاہ قائم کر دی جس میں ہزاروں تشنگان حقائق حاضر ہو کر کسب فیض کرتے تھے۔ اس درس گاہ میں دیگر علوم کے ساتھ ساتھ علم فقہ کو خصوصی اہمیت حاصل رہی۔ اس حوالے سے آپ کو "فقہ جعفریہ" کا بانی کہا جاتا ہے۔ آپ کے دور میں دہریت کا چرچہ عام تھا۔ چنانچہ آپ کے ساتھ دہریوں کے اعتقادی مسائل پر مناظرے بھی ہوئے جن میں آپ نے عقیدہ توحید و خدا پرستی کی حقانیت کو ثابت کیا۔ حضرت امام جعفر صادقؑ کے باصلاحیت شاگردوں نے آپ سے براہ راست علوم و معارف حدیث و روایت حاصل کر کے چار سو اصولوں پر مشتمل علمی خزانہ پیش کیا۔ جو فقہ جعفریہ کی چار بنیادی کتب (کافی من لا یحضرۃ' الفقیہ' تہذیب' استبصار) کا سرچشمہ ہے۔ کتب تاریخ میں مذکور ہے کہ آپ کے جلسہ درس میں چار ہزار طلبہ بیک وقت کسب علم و فیض کرتے تھے۔ آپ کو صادق کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا اور آپ نے اپنی پاکیزہ

زندگی میں علوم معارف کی تدریس کے ساتھ ساتھ امت اسلامیہ کی فکری و اخلاقی' اجتماعی و سیاسی رہبری کا فریضہ ادا کیا۔ اپنے وقت کے حکمرانوں سے نہ تو خائف ہوئے اور نہ ہی ان کے طوق بندگی کے اسیر بنے بلکہ عباسی سلطنت میں آپ نے اپنی الٰہی ذمہ داریاں پوری کیں' اصلاح معاشرہ کے لیے اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر دیں۔ حضرت امام جعفر صادقؑ دیگر آئمہ اہل بیتؑ کی طرح اپنے دور کے حکام سے نبرد آزما رہے اور ارباب اقتدار کی ستم کاریوں سے مرعوب نہ ہوئے جو کہ آپ کے آباؤاجداد اور معصوم ہستیوں کا شیوہ رہا ہے' دنیا اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ ہر معصوم امام سلاطین زمانہ کے جور و جبر کا شکار ہوا مگر کسی نے اپنے برحق مئوقف سے دستبردار ہونا قبول نہ کیا۔ آپ کی پوری زندگی فضیلتوں اور عظمتوں کا مجموعہ ہے۔ آپ کی ولادت کے حوالہ سے اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ آپ کے بتائے ہوئے علمی اصولوں اور آپ کی سیرت طیبہ سے استفادہ کیا جائے۔ تو دنیا کا گھر اور امن کا گہوارہ بن سکتی ہے۔

(بموقعہ ولادت امام جعفر صادقؑ ۱۹۹۷ء)

ذکر اس کا جس کا ذکر عبادت ہے

یہ ایک حقیقت ہے کہ جو افراد بشریت اپنے کرداروں اور فضیلتوں کے حوالے سے معراج کمال پاتے ہیں' ان سے نسبت رکھنے والے ایام بھی برکت و رحمت کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی کردار سازی میں اپنی وجودی تاثیر کے اظہار میں کسی بھی مادی رکاوٹ کو لمحات کے قدموں میں روند دیتے ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ وقت ایک جیسا نہیں رہتا مگر اس حقیقت سے چشم پوشی بھی ممکن نہیں کہ وقت کے دامن میں پائے جانے والے تاریخی کردار وقت کے دھارے کو بدل دیتے ہیں اور پھر وقت آنے پر اپنی طاقت کا مظاہرہ اس طرح کرتے ہیں کہ حالات کی ظلمتیں ان کے چہرہ وجود پر نقاب نہیں بن سکتیں بلکہ ان ظلماتی حجابوں کو پارہ پارہ کرتے ہوئے وہ نورانی کردار اپنی روشنی کاشانہ فکر و نظر میں بکھیر دیتے ہیں جس کے نتیجے میں دل ان کی محبت سے معمور اور زبان ان کے تذکرے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

تاریخ کی ورق گردانی سے نورافشاں کرداروں کی حقیقتیں خود بخود سامنے آ جاتی ہیں بشرطیکہ نگاہ دل پر مجاز پرستی کے پردے نہ پڑے ہوں اور

فضائے شعور میں ردائے تعصب زیب تن کئے ظلمانی بادلوں کا راج نہ ہو' صاف دل اور شفاف نظروں سے تاریخ کی وادی میں جھانکنے والا ہر باشعور انسان ان کردار ساز حقیقتوں کے مطالعاتی دیدار سے یقیناً" لطف اندوز ہوتا ہے جو اپنے وجود کی فضیلت آفرینی سے انسانی بستی کے کوچہ و بازار میں عظمتوں کے لعل و جواہر بانٹتے ہیں۔ ہمارا ممدوح اسی قافلہ فضیلت کا ایک ایسا سالار ہے جس کے نورانی بدن کو لباس وجود دینے کے لیے اس "مکان" کا انتخاب عمل میں آیا جس کی نسبت "لامکان" سے ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس "گھر" کی تعمیر میں آب و گل کی آمیزش کا عمل بھی دست عصمت سے ہو اور اس کی تطہیر کا مقصود "عبادت" ٹھہرا' ایسے گھر میں اپنے لباس وجود کو شکل و ظہور کا شرف دینے والا نومولود عظمتوں کی کائنات پر چھا گیا' اس نے دلوں میں اپنے عشق کا چمن بسایا' ذہنوں میں اپنے علم کی محفل سجائی اور زبانوں کو اپنی عقیدت کے اظہار کا سلیقہ بخشا کہ پھر اس کی محبت' اس کا ذکر اور اس کا دیدار "عبادت" بن گیا پھر جو آنکھ اس کے جمال رخ پر پڑی' اس کی بصارت بصیرت کی دولت سے مالا مال ہو گئی اور جو زبان اس کی نام لیوا ہوئی' وہ اپنی طہارت کی سند پا گئی اور جس دل نے اس کی چاہت کو سینے سے لگایا وہ معرفت کا خزینہ بن گیا ایسا کیوں نہ ہوتا کیوں کہ اسے خالق نے اپنے نام سے مشتق کر کے "علی" سے موسوم کیا' اس کی پرورش کے لیے کائنات کے سردار "محمد" اور پدری نسبت کے لیے سید الانبیاءؐ کے مربی "ابو طالب" کا انتخاب کیا اور پھر اسے ذات و صفات میں "علی" ہونے کے حوالے سے اپنے حبیب مصطفیٰ کے بعد کائنات میں سب سے "اعلیٰ" بنا دیا'

۱۳ رجب مؤمن کامل کے فرزند' حبیب خدا کے حبیب اور کل ایمان

اور اہل یقین کے امام حضرت علی خدا کے گھر خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے کہ ہم اسی پاکیزہ مناسبت سے عظیم باپ کے عظیم فرزند سے اس عہد ولا کی تجدید کرتے ہیں جو عالم ذر میں ہر فرد بشر نے اپنے آفرید گار سے کیا کہ اب اس وجودی معاہدے کا عملی ثبوت فراہم کریں گے تاکہ وجود حاصل کرنے کی فطری حیثیت برقرار رہے۔

۲۱ رمضان کو مولود کعبہ شہید محراب ہو گئے اور جاتے جاتے اپنے چاہنے والوں کو اپنی کامیاب زندگی کے بارے میں قسم کھاکر بتا گئے کہ "فزت و رب الکعبتہ" مجھے کعبہ کے پروردگار کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔ "جو کامیاب زندگی چاہتے ہیں انہیں مولود کعبہ اور شہید مسجد کی حیات طیبہ کے ہر پہلو کی عملی تقلیدی کرنی ہوگی کہ کسب کمالات و حصول سعادت کا اس سے زیادہ آسان راستہ اور کوئی نہیں'

علی کی پہچان کے لیے خود علی کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کافی' وافی' جامع اور واضح ہیں کہ اس سے زیادہ اظہار فضیلت ممکن نہیں۔ امام نے کہا:

اِلٰهی کَفٰی بِی عِزًا اَنَ اَکُوْنَ لَکَ عَبْدًا وَ کَفٰی بِی فَخْرًا اَنَ تَکُوْنَ لِی رَبًّا فَانَتَ کَمَا اَحَبُّ فَاجْعَلْنِیْ کَمَا تُحِبُّ'

اے میرے معبود! میرے لیے یہ اعزاز کافی ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں اور میرے لیے اس سے بڑا وجہ ناز کچھ نہیں ہو سکتا کہ تو میرا پروردگار ہے تو تو ویسا ہی ہے جیسا میں چاہتا ہوں مجھے بھی ویسا ہی بنا دے جیسا کہ تو چاہتا ہے' یا علی! سلام ہو تیرے اظہار عبدیت اور تمنائے کمالیت پر'

(بمناسبت ۱۳ رجب یوم ولادت حضرت امیر المومنین علیؑ ۱۹۹۸ء)

بیسویں صدی

کیا کھویا، کیا پایا؟ اور اب؟

بیسویں صدی اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہے اور کسے خبر کہ اکیسویں صدی کی صبح نو طلوع ہونے تک دنیا کے نقشے پر نجانے کتنے نقوش نمودار اور کتنے محو ہو چکے ہوں گے، خدا کے سوا کون جانتا ہے کہ کل کیا ہو گا؟ آنے والے کل کا انتظار ہی ہے جو امیدوں کی بستیاں بسانے کی راہ ہموار کرتا ہے اور اسی انتظار کے سائے میں صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے، زندگی یونہی تمام ہوتی ہے، کچھ تمنائیں پوری ہوتی ہیں اور کتنی آرزوں کے بارے میں انسان یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اب دیکھنا یہ ہے کہ آنے والی نئی صدی میں ہم اگر موجود ہوئے تو اس کی تعمیر ہماری تقدیر کی تنویر کا سبب بنے گی یا تخدیر کا باعث ہو گی؟۔ اس کا جواب نہایت واضح ہے کہ ہم اپنے ماضی قریب کو دیکھ لیں کہ ہم نے اس میں کیا کھویا، کیا پایا؟۔ جو کچھ کھو چکے اس کے حصول کے لیے عزم بالجزم اور جو کچھ پا چکے اس

کی مثبت صورتوں میں عقیدہ و عمل اور فکر و نظر کے خوب صورت رنگ بھرنے کے لیے بھرپور منصوبہ بندی کریں کیونکہ انسان کا کام سعی و کوشش ہے کہ جس کی تکمیل کے اسباب فراہم کرنا خدا کا کام ہے۔ انسان اپنا کام نیک نیتی سے انجام دے تو خدا نیت و ارادہ کے مطابق عمل کی تکمیل کرتا ہے۔

اس وقت دنیا کے گوشہ گوشہ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں' انسان انسان کا خون بہا رہا ہے' انسانی حقوق کے نام پر انسانی حقوق پامال کئے جا رہے ہیں' انسان ہی انسان کا دشمن ہے' دنیا میں قیام امن کے ٹھیکیدار نت نئے مہلک ہتھیار تیار کرکے اپنے ہی خواہوں کے ہاتھوں میں دے کر صرف نظریاتی اختلاف رکھنے والوں کو کچل دینے کی راہ دکھا رہے ہیں۔ گذشتہ صدی میں کتنے خونیں انقلاب رونما ہوئے' ایشیائی ممالک بالخصوص مسلمانوں کی آبادیوں میں کس قدر انسانی جانیں ضائع ہوئیں اور دہشت و بربریت سے وحشت و انتشار کا ماحول پیدا کیا گیا' کہیں فرقہ واریت کی آگ بھڑکائی گئی اور جذبات سے کھیل کر وحشیانہ طور پر انسانیت کا قتل عام ہوا' کہیں حریت و آزادی کے حصول کے لیے اٹھنے والی آوازوں کو دبانے کے لیے طاقت کا اندھا دھند استعمال کیا گیا' کہیں معاشی عدم استحکام پیدا کرنے کے لیے وسائل کی غیرعادلانہ تقسیم ہوئی اور کہیں سیاسی رسہ کشی کا ماحول پیدا کرکے غیرانسانی مفادات حاصل کئے گئے۔ گویا اعتقادی' معاشی و سیاسی حوالوں سے انسانیت کشی کا بازار گرم کیا گیا' دنیا کے نقشہ پر کون سا ایسا ملک یا خطہ ہے جہاں ہر لحاظ سے امن و سلامتی اور خوش حالی حکمفرما ہے؟۔ ممکن ہے اس کے جواب میں ہم اپنے آپ کو بری الذمہ سمجھتے ہوئے دوسروں کو مورد الزام قرار دیں کیونکہ کوئی فرد کسی برائی کو

اپنے نام لینے کو تیار نہیں لیکن حقائق سے چشم پوشی تو ہو سکتی ہے مگر ان کا انکار نہیں ہو سکتا' ان تمام حالات میں اصل قصور کس کا ہے؟۔ ان تمام خرابیوں کا ذمہ دار کون ہے؟۔ اس کا جواب کم و بیش ہر شخص کو معلوم ہے' لہٰذا مادی ترقی و پیش رفت اور سائنس کی محیرالعقول فتوحات و ایجادات کے باوجود بنی نوع آدم اپنی فطری حیثیت کا تحفظ کرنے میں جس طرح ناکام ہو رہے ہیں' وہ ایک المیہ ہے علم و تحقیق کی اس تیز رفتار دنیا میں جاہلانہ طرز عمل کا خاتمہ ضروری ہے' حکومتوں کے وسائل افراد بشر کی صلاح و فلاح کے لیے استعمال ہونے کی بجائے مخصوص و محدود اور معین مقاصد کے حصول سے مختص ہو کر رہ گئے ہیں۔ عالمی سطح پر انسانی حقوق کی تنظیمیں' اسلامی کانفرنس اور دیگر ادارے گذشتہ صدی میں رونما ہونے والے واقعات کا تفصیلی جائزہ لے کر آنے والی صدی کے لیے مثبت و ٹھوس منصوبہ بندی کریں تو مشکلات پر قابو پانا آسان ہی نہیں بلکہ یقینی ہو سکتا ہے چنانچہ گذرے ہوئے برسوں میں تعلیمی' معاشی اور معاشرتی ترقی کے لیے جتنے اقدامات ہوئے ان کے مثبت و منفی پہلوؤں کا تقابلی جائزہ ضروری ہے۔ کمپیوٹر نے غیر معمولی وسعتوں کے ساتھ پوری دنیا کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔ جغرافیائی فاصلے اب فاصلے نہیں سمجھے جاتے۔ مشرق کے مکین مغرب کے باسیوں سے اور شمال کے رہنے والے جنوب میں زندگی بسر کرنے والوں سے باخبر ہی نہیں ہر آن رابطوں میں ہیں تو کیا اس پیش رفت سے استفادہ کرتے ہوئے ترقی و امن کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنا ممکن نہیں؟۔ مادی وسائل کی ترقی میں ترقی کو منحصر سمجھنا بذات خود ایک غلطی ہے۔ اصل ترقی اخلاقی قدروں اور انسانی معیاروں کے تحفظ کا نام ہے کہ جس کے نتیجے میں انسانی معاشرہ امن و

سلامتی کی دولت سے مالا مال ہو سکتا ہے۔

اس مختصر اظہار خیال کے بعد ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ایک دوسرے کو گزرے ہوئے سالوں میں کیا کھویا پایا کی بنیاد پر منصفانہ خود احتسابی کی طرف متوجہ کریں ہیں تاکہ آنے والی صدی کا استقبال قوت قلب' مضبوط ارادے اور تمنائے توفیق حق کے ساتھ کر سکیں' ہماری کامیاب زندگی کا اصل راز ہمارے اپنے ارادے کی پختگی اور خالق کی طرف سے حاصل ہونے والی توفیق میں مضمر ہے' آیئے اپنے آپ سے اور اپنے خالق سے عہد کریں کہ اپنی عبدیت کی بستی میں للہیت کی روشنی بکھیر کر دنیا کو آخرت کی کھیتی بنائیں گے کہ پھر ہماری خودی پر خدا راضی ہو کر ہم سے پوچھے گا' بتا تیری رضا کیا ہے؟۔

(دسمبر ۱۹۹۹ء)

اکیسویں صدی عیسوی: خوش آمدید

اکیسویں صدی کا آغاز ہو چکا ہے اور دنیا بھر میں اسی حوالے سے بہت کچھ کہا اور لکھا جا رہا ہے۔ افواہوں کا بازار گرم ہے' سیاسی و معاشرتی امور میں تبدیلیوں کی پیش گوئیاں کی جا رہی ہیں یہاں تک کہ بعض "مفکرین" اور "ماہرین غیب تراشی" نے نئی صدی کے آغاز پر دنیا کے خاتمہ کی "بشارت" بھی دی ہے۔ بعض اخبارات میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ "دانشوروں" اور سائنسی علوم کے بعض اہل الرائے شخصیات نے اعلان کر دیا ہے کہ "قیامت" آنے والی ہے اور عنقریب دنیا تباہ ہو جائے گی' بعض ایشیائی ممالک میں غیب گوئی کے بادشاہوں نے لوگوں کو خبردار کیا ہے کہ نئی صدی کے آغاز پر غذائی مواد مفقود ہو جائے گا لہٰذا ابھی سے کھانے پینے کی اشیاء کا ذخیرہ کرلیا جائے تاکہ بعد میں دشواری نہ ہو' یہ اور اس کے علاوہ بہت کچھ!

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان تمام بیانات کا پس منظر کیا ہے اور اس کے پیچھے کیا عوامل و اسباب اور کار فرما ہیں؟۔ اس سلسلے میں شاید یہی کہنا تمام مسائل کا جواب ہو گا کہ ان تمام اظہارات میں اقتصادی و سیاسی عوامل کی اثرداری کے ساتھ ساتھ اہم ترین عنصر نفسیاتی ہے۔ اخلاقی و معاشرتی حوالے بھی نظرانداز

نہیں کئے جا سکتے لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ ابھی ہم اپنے مقام و مرتبہ وجود اور مقصد تخلیق کو ہی نہیں سمجھے اور ہر متوقع امر کی بابت یا تو ترجیحات کا دامن تھام لیتے ہیں اور یا پھر تحفظات کی راہ پر چل نکلتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خداوند عالم نے ہمیں اپنا شاہکار قدرت بنایا ہے اور پوری کائنات کی نعمتیں ہمارے ارادہ و اختیار میں قرار دی ہیں لیکن ہم نہ تو اپنے اشرف المخلوقات ہونے کو خاطر میں لاتے ہیں اور نہ ہی خدا کی عطاء کردہ نعمتوں سے صحیح استفادہ کرنے میں عقلی اصولوں اور خدائی تعلیمات کو اپناتے ہیں' ہم عموماً" اپنے ماحول اور اس میں جنم لینے والے حوادث سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ جب کہ ہماری امتیازی حیثیت اس قوت عقل کے سبب سے ہے کہ جس کے ذریعے اچھے اور برے کی تمیز ممکن ہوتی ہے' مگر اس قوت عقل سے استفادہ نہیں ہوتا اور اگر کسی حد تک ہوتا بھی ہے تو وہ صحیح خطوط پر استوار نہیں ہوتا۔ مادی عوامل اس قدر ہم پر اثر انداز ہوتے ہیں کہ ہم روحانی اقدار و اہداف کو بھلا دیتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان نفسیاتی طور پر جاذبہ اور دافعہ کا شکار ہوتا ہے۔ مال و دولت اور جاہ و اقتدار کے جاذبہ و کشش کا انسان کے نفسیاتی نظام پر مسلط ہونا ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے اسی طرح ان کے حصول کی کوشش پر ناکامی متعدد نفسیاتی امراض کے وجود میں آنے کا سبب بنتی ہے جس سے انسان تخیلات و توہمات کی زنجیروں میں جکڑا جاتا ہے۔ اس سنگین صورت حال سے نمٹنے کے لیے صرف اور صرف ایک راستہ ہے جس پر چل کر اپنے وجودی مرتبہ کا تحفظ بھی ہو سکتا ہے اور حصول سعادت کی کوششیں بھی نتیجہ

بخش ثابت ہو سکتی ہیں اور وہ عبارت ہے خدا کی مکمل اطاعت اور اس کے مقرر کئے ہوئے معصوم رہبروں کی تعلیمات پر مکمل عمل کرنے سے۔

مذکورہ بالا اصول کی روشنی میں نہ تو ہمیں گردش لیل و نہار خوفزدہ کر سکتی ہے اور نہ ہی صدیوں کا آنا جانا ہمارے ارادوں اور قوت عمل کو متاثر کر سکتا ہے بلکہ ہمارے عزم میں پختگی اور مقصد میں کامیابی کو یقینی بنانے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ لہٰذا نئی صدی کی آمد پر ہمیں اس کا پختہ ارادہ کے ساتھ استقبال کرنا چاہیے اور زبان دل سے اسے خوش آمدید کہنا چاہیے تاکہ ہم تازہ دم ہو کر اپنے اصول فطرت کا تحفظ کر سکیں اور ہر قسم کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو مکمل طور پر تیار و آمادہ کر سکیں تو آیئے ہم سب مل کر نئی صدی کو خوش آمدید کہتے ہیں اور خالق کی بارگاہ میں توفیق اعمال صالحہ کی دعا کرتے ہیں۔

خدایا! ہمیں اکیسویں صدی عیسوی میں سچا انسان اور خالص مسلمان بننے کی توفیق عطا فرما تاکہ قیامت کے دن تیرے حضور سرخرو ہو سکیں۔

(جنوری ۲۰۰۰ء)

میلاد علیؑ کے حوالے سے!

خداوند عالم نے اپنے گھر کی تعمیر دو نبیوں کے ذریعے کروائی۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت اسماعیل ذبیح اللہ ' یہ باپ و بیٹا خدا کی طرف سے مامور ہوئے کہ خانہ خدا کو پاک و پاکیزہ ہاتھوں سے تعمیر کریں۔ جب حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کعبہ کی دیواریں کھڑی کر رہے تھے تو دونوں نے دعا کی۔ خدایا! ہمارے اس عمل کو شرف قبولیت عطا فرما اور ہمیں اور ہماری نسل کو اپنا سچا مسلمان قرار دے اور ہمیں ہمارے فرائض سے آگاہی دلا اور ہماری توبہ قبول فرما کہ تو ہی سب سے بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

"وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاهِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَ اِسْمَاعِیْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔ وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّیَتِنَا اُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَیْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَابُ الرَّحِیْمُ"

خداوند عالم نے اپنے گھر کو عبادت گزاروں اور اس کا طواف کرنے والوں کے لیے بنوایا اور اس کی تطہیر کا عمل دو بزرگ نبیوں نے انجام دیا چنانچہ

حکم الٰہی ہوا۔

"اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ وَ الْعَاكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْد

(میرے گھر کو پاک کرو طواف کرنے والوں کے لیے' اعتکاف بیٹھنے والوں' رکوع کرنے والوں و سجدہ کرنے والوں کے لیے) (سورۂ بقرہ' ۱۲۵)

اس مبارک و مقدس اور مطہر گھر میں خداوند عالم نے ایک ایسے مولود کی ولادت کا معجزہ کے طور پر اہتمام کیا کہ تاریخ میں یہ منفرد فضیلت اسی مولود سے مختص و مخصوص ہو گئی۔ دیوار شق ہوئی اور حضرت ابوطالب کی زوجہ مکرمہ حضرت فاطمہ بنت اسد خانہ کعبہ کے اندر داخل ہو گئیں اور ان کے اندر آتے ہی دیوار دوبارہ بند ہو گئی۔ تین روز تک خانہ خدا کے در و دیوار بند رہے۔ اسی دوران خداوند عالم نے نومولود اور ان کی والدہ کو رزق خاص عطا فرمایا۔ یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس پر تمام اسلامی مذاہب و مکاتب فکر متفق ہیں۔ یہ شرف و اعزاز حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالب کے علاوہ دنیا میں اور کسی کو بھی نصیب نہ ہوا کہ جس کے بارے میں شاعر نے کہا ہے:

کسے را میسر شد ایں سعادت
بہ کعبہ ولادت بہ مسجد شہادت

(کسی کو بھی یہ سعادت نصیب نہ ہوئی کہ کعبہ میں ولادت ہو اور مسجد میں شہادت ہو)

حضرت علی خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے۔ خدا کا گھر خدا کے ولی کی ولادت سے منور ہوا اور اس میں رکھے ہوئے بتوں کا بت شکن آگیا کہ جس نے اپنے

استاد و عربی حضرت ختمی مرتب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کندھوں پر چڑھ کر بالا خر خدا کے گھر کو بتوں سے پاک کر دیا اور تمام بت توڑ دیئے۔

خانہ کعبہ میں میلاد علیؑ تاریخ اسلام کا منفرد واقعہ ہے اس سے مولود کی عظمت اور طہارت و پاکیزگی کا ثبوت ملتا ہے کیوں کہ خانہ خدا صرف عبادت کدہ ہے اس میں کسی کی پیدائش بظاہر اس کی تعمیر کے مقصد سے ہم آہنگ دکھائی نہیں دیتی خاص طور پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ ولادت کا عمل عموماً" طہارت کے منافی ہوتا ہے مگر حضرت فاطمہ بنت اسد کے لیے کعبہ کی دیوار کا شق ہونا اور پھر ان کے اندر داخل ہونے کے بعد اس کا دوبارہ بند ہو جانا اس حقیقت کی دلیل ہے کہ یہ خدائی اہتمام تھا لہٰذا اس میں طہارت کے حوالہ سے بحث کرنا بے معنی ہے۔

حضرت علی کی ولادت ۱۳ رجب کو ہوئی اور آپ کے بارے میں پیغمبر اسلام کا ارشاد گرامی ہے "انا و علی من نور واحد" میں اور علی ایک ہی نور سے ہیں تو یہاں سے اس سوال کا جواب مل جاتا ہے کہ کعبہ اور ولادت کے عمل میں طہارت کے حوالے سے مطابقت کیونکر ممکن ہے؟۔

بہرحال آپ کی ذات گرامی نہایت بلند مرتبہ اور آپ کا کردار حضرت پیغمبر اسلامؐ کے کردار کا آئینہ اور آپ کی گفتار آنحضرت کی گفتار کا عکس ہے۔ آپ اپنے وجود میں فضائل و کمالات کی ایک وسیع کائنات تھے اور خدا کی سبتی میں خدا کے بندوں پر خدا کی حجت' آپ نے توحید کی معرفت اور نبوت کی پہچان جس طرح کروائی اس سے آپ کے علمی کمال کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ آپ ہی تو ہیں کہ جن کے بارے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَ عَلِیٌّ بَابُھَا

(میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں)

ہماری عقیدت و محبت کا سلام ہو آپ پر!

(بمناسبت ولادت حضرت علیؑ ۱۹۹۷ء)

نیمہ شعبان: تجدید عہد کا دن

تاریخ اسلام کے جو اہم ایام اپنے دمن میں مخصوص نورانی مناسبتیں رکھتے ہیں ان میں سے ایک نیمہ شعبان ہے' اس روز ایک عظیم شخصیت کی ولادت ہوئی- پندرہ شعبان 255ھ حضرت امام زمانہ مہدی علیہ السلام کی ولادت کے حوالہ سے خوشی و مسرت کا دن ہے' ہر سال اس دن کو امام زمانہ کے دیدار کے مشتاق ارباب بصیرت اپنے قلبی جذبات و احساسات کا اظہار کرتے ہیں اور امام کے ظہور کی دعائیں مانگتے ہیں' زمانہ ستمگروں' آمروں' ظالموں اور انسانیت دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار بلا ہے' دنیا میں ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی ہے' قدرتی عطا کردہ وجودی نعمتوں سے صحیح استفادہ کرنے کے بجائے ان کے ناجائز استعمال کی رسم عام ہے' انسان کے ہاتھوں انسان کا قتل عام ہو رہا ہے' کوئی کسی پر رحم نہیں کرتا' ایسے حالات میں مظلوموں کی چیخیں اور محروموں کی فریادیں کاشانہ ہستی کے در و بام ہلام دیتی ہیں ہر فرد اپنے حقوق کی پامالی کی شکایت کرتا ہے' کوئی بھی اپنے ماحول' اپنی زندگی اور اپنے معاشرے سے خوش نہیں مگر معدودے چند کہ وہ بھی صبر کا دامن تھامے اظہار عقیدت کرتے ہوئے نظر آتے

ہیں' یا یہ زمانہ کہ جس کا ہر لمحہ پہلے اور دوسرے لمہ سے مختلف ہے اور اس اختلاف کی فطری روایت کو تسلیم کرتے ہوئے اہل زمانہ کبھی تو سکوت اور کبھی اظہار کو اختیار کرتے ہوئے ہوئے دکھائی دیتے ہیں مگر عقل کہتی ہے کہ ظلم کے سامنے سکوت کا اختیار ہر صورت میں بھی درست نہیں اور اظہار کے لیے بھی مصلحت و مفسدت کی تشخیص کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے تو اس مشکل وقت میں اہل زمانہ امام زمانہ کی تلاش میں نکلتے ہیں جو سکوت وا ظہار کے مابین حیرت زدہ انسان کو راہ راست کی ہدایت کرکے ان دونوں میں سے کسی ایک کے اختیار کو یقین بنائے اور پھر حق و فرض کے مسائل بھی حل ہو جائیں۔

یہ ایک عقلی حقیقت ہے کہ زمانہ کبھی اہل زمانہ کو امام زمانہ سے بے نیاز نہیں کرتا اور نہ ہی زمانہ خود امام زمانہ سے خالی ہو سکتا ہے ورنہ زمانہ کا تشخص ہی ختم ہو جائے گا۔ اور اس کی بقا فنا میں بدل جائے گی لہٰذا فطرت سلیمہ کا فیصلہ ہے کہ زمانہ کی باگ ڈور امام زمانہ ہی کے ہاتھوں میں رہنی چاہیے کہ اگر اس کے برعکس کسی اہل زمانہ نے اقتدار زمانہ کا استحقاق اپنے لیے مخصوص کرنا چاہا یا اس کی کوشش کی تو پھر انسانی حقوق کی پامالی کی راہ خود بخود ہموار ہو جائے گی' یہ سلسلہ اسی دور میں ہی تھیں بلکہ ہر دور میں چلتا رہا اور ہر دور میں اس کی شکلیں مختلف رہیں مگر کائنات کی وجودی حیثیت کا تحفظ اور زمانہ کی بقا امام زمانہ ہی کے ذریعے ممکن ہوئی' بنا برایں امام زمانہ کا وجود ضروری اور اس سے کسب فیض کرنے کا جذبہ بھی ناقابل انکار فطری حقیقت ہے بات صرف امام زمانہ کے مصداق کی ہے تو اس سلسلے میں کسی مزید پیچیدگی کا شکار ہونے کی بجائے زمانہ کے خالق کے انتخاب کو اپنانا ہی مسئلہ کا صحیح حل ہے کہ جس ذات نے زمانہ و اہل

زمانہ کو پیدا کی اسی کا حق ہے کہ امام زمانہ کی تعیین اور صرف تعیین ہی نہیں بلکہ نشاندہی بھی کر دے' چنانچہ ایسا ہی ہوا خالق نے زمانہ و اہل زمانہ کے لیے امام زمانہ کا تعین اور نشاندہی کروا دی اور لوگوں کو اس کی معرفت دلادی تاکہ زمانہ کی رفتار اور اہل زمانہ کا کردار فطرت سلیمہ سے ہم آہنگ رہے۔

اس وقت کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ امام زمانہ کے ظہور کا انتظار کرتے ہوئے ان کی خدمت میں اپنے حضور کی تیاری کریں' نیمہ شعبان امام زمانہ سے تجدید عہد کا دن ہے اس حوالہ سے امام زمانہ کہ جن کی نشاندہی حضرت پیغمبر اسلامؐ نے خدا کے حکم سے کر دی ہے کہ وہ مہدی بن حسنؑ عسکری ہیں ان کا انتظار اعتقادی اور عملی طور پر کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا وہ (مہدیؑ) قیامت سے پہلے ظہور پذیر ہو کر دنیا میں ظلم و استبداد کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے گا۔ اور عدل و انصاف قائم کر دے گا اور پردۂ غیبت سے باہر آکر زمانہ میں اہل زمانہ کو خالق زمانہ کی زاہ پر لگا دے گا' آئیں نیمہ شعبان میں امام زمانہؑ سے تجدید عہد کریں اور اپنی فکری و عملی صلاحیتوں کو امام زمانہ کے ظہور تک مکمل کریں تاکہ ان کے حضور شرفیاب ہو سکیں۔

(بمناسبت ولادت امام مہدیؑ ۱۹۹۸ء)

افغانستان میں اسلامی نظام حکومت

عرصہ دراز سے افغانستان آتش جنگ کے وحشت ناک شعلوں کی لپیٹ میں ہے اس میں امن و امان مفقود ہو چکا ہے اس کی سلامتی کو اس طرح بری نظر لگی ہے کہ اس کے باسی اپنوں اور غیروں دونوں کے ہاتھوں مظالم کا شکار ہو رہے ہیں' اس کی تاریخ بہت قدیم ہے اس کے عوام کٹر مسلمان ہونے کے حوالہ سے شہرت رکھتے ہیں ان کی تاریخ جدوجہد اور جذبہ جہاد سے عبارت ہے' خوبصورت وادیوں اور سربہ فلک پہاڑوں کی یہ سرزمین بلاشبہ ایک جنت نظیر خطہ ہے مگر اس کی ظاہری خوبصورتی اور فطری جمال کو کسی بد نظر کی نظر کھا گئی ہے' یہ ملک محنت کشوں کا گھر ہے لیکن ان محنت کشوں کو غلط راستہ پر لگا دیا گیا ہے اور انہیں علم کی روشنی سے محروم رکھ کر ترقی سے دور رکھا گیا ہے۔

افغانستان واحد اسلامی ملک ہے جس نے اپنے سے کئی گناہ بلکہ ناقابل موازنہ طاقتور ملک روس کو شکست سے دوچار کر دیا روسی جارحیت پسندوں نے اس پر قبضہ کرنے کے لیے ہر ممکن کوششیں کیں مگر اس ملک کے پرعزم و استقلال عوام نے کمیونسٹوں اور اسلام دشمنوں کی سازشوں کو ناکام بنا دیا اور ان

کے عزائم کو خاک میں ملا دیا' بھرپور جدوجہد کے بعد روسی فوجیوں کو افغانستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور بالآخر زمام اقتدار وہاں کے عوام نے سنبھال لی' اقتدار سنبھالنے کے بعد تمام سیاسی قوتوں نے ملک میں اسلامی نظام حکومت کے قیام پر اتفاق کرتے ہوئے اس کا اعلان کر دیا- اس میں کوئی شک نہیں کہ عوام ہی اپنے ملک کے بارے میں صحیح فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہے انہی کا فیصلہ ہی اصل بنیادی حیثیت رکھتا ہے-

بہرحال روسی فوجوں کی پسپائی اور جمہوریت کے قیام کے بعد سیاسی جماعتوں کا آپس میں دست و گریبان ہونا افغانستان کی بد قسمتی کا سبب بن گیا' نام نہاد سپر پاورز نے اس ملک کی سیاسی جماعتوں کے باہمی اختلافات کو ہوا دی ویسے بھی جہاد افغانستان کے نام پر قائم سیاسی جماعتوں کی وہاں کمی نہیں ان جماعتوں میں کوئی امریکی اور کوئی روسی بلاک سے وابستہ ہے' برھان الدین ربانی افغانستان کے سربراہ مملکت کی حیثیت سے کام کرتے رہے مگر "غیبی" طور پر طالبان کے نام سے ایک جماعت افغانستان کے سیاسی افق پر نمودار ہوگئی' یہ ایک نہایت حیران کن مسئلہ تھا کیونکہ اس گروہ کی نہ تو سیاسی خدمات تھیں اور نہ ہی معاشرتی سطح پر مضبوط پوزیشن تھی اور نہ ہی جہادی کاوشوں میں کوئی اہم اور نمایاں کردار تھا' ادھر اسلامی انقلاب ایران کامیاب ہوچکا تھا لہٰذا افغانستان میں اس "غیبی" گروہ کے اقتدار پر قابض ہونے کو ایران کیا سلامی انقلاب کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے والی ایک علاقائی قوت کی حیثیت حاصل ہوگئی' چنانچہ اس کا عملی ثبوت افغانستان کے اندر ایرانی سفارتی نمائندوں کی ہلاکت اور ہمسایہ ملک پاکستان میں فرقہ پرستی کی آگ کو شعلہ ور کرکے آئے دن قتل و غارت کی

کاروائیوں کی صورت میں سامنے آیا' افغانستان کے عوام کی بدقسمتی یہ ہے کہ عالمی سطح پر انہیں غربت و جہالت کے حوالہ سے پہچانا جاتا ہے جبکہ ان کی قدیم تاریخ علمی اعتبار سے درخشندہ ہے اور یہاں قدرتی وسائل کی بھی کمی نہیں مگر دوسرے ملکوں نے ہمیشہ اس کی شاداب زمین کو آلودہ کرکے اپنے مفادات حاصل کئے- اب وقت ہے کہ افغانستان کے عوام آزادانہ انتخابات کے ذریعے خوشحالی کے لیے ٹھوس اقدامات کریں اور بیرونی عوامل سے وابستگی کے تمام رشتے توڑ کر عزت و استقلال کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے اسباب فراہم کریں' اسلامی نظام حکومت میں ہر طرح کی دہشت گردی اور قتل و غارت کو ناقابل معافی جرم قرار دیا گیا ہے لہٰذا طالبان کے مقتدر افراد ان کاروائیوں کا سد باب کریں اور ملک کے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے اپنی توانائیاں صرف کریں' دنیا میں کوئی بھی مسلمان ملک اسلامی نظام حکومت کا مخالف نہیں ہو سکتا بات صرف یہ ہے کہ نفاذ و اجرا میں کیا طرز عمل اختیار کیا جاتا ہے؟ غیر جمہوری طریقے سے اقتدار پر قبضہ بذات خود ایک غیر اسلامی فعل ہے کہ جس کو عوامی تائید حاصل نہیں اس لیے عوام کی اکثریت کا متفقہ فیصلہ ہی افغانستان کے مسائل اور مشکلات کا واحد حل ہے ورنہ اس میں قائم نظام حکومت کو اسلامی نظام حکومت نہیں کہا جا سکتا-

(اگست ۱۹۹۹ء)

روزہ: قرب خداوندی کا بہترین ذریعہ

خداوند عالم نے اپنی مخلوق کے لیے جو احکام صادر فرمائے ہیں ان سب میں لوگوں کی سعادت و خوش بختی اور فلاح و صلاح ملحوظ ہے' انہی احکام میں وہ عبادات بھی شامل ہیں جن کی ادائیگی کو خدا نے بندوں پر لازم و واجب قرار دیا ہے کہ جن میں سے ایک عبادتی عمل روزہ ہے' روزہ کے وجوب کے بارے میں خداوند عالم نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

"یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ" (اے اہل ایمان! تم پر روزے لکھ دیئے گئے ہیں (واجب کر دیئے گئے ہیں) جس طرح ان لوگوں پر واجب کئے گئے تھے جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم متقی ہو جاؤ"

خداوند عالم نے روزہ کے وجوب کا اعلان اس کے مقصد اور ہدف کے ذکر کے ساتھ کر دیا کہ روزہ اس لیے واجب قرار دیا گیا ہے کہ لوگ متقی و پرہیز گار ہو جائیں' روزہ ماہ رمضان المبارک میں واجب کیا جانے والا وہ عبادتی فریضہ ہے جس سے روز دار انسان قرب خداوندی کے حصول میں کامیاب ہو سکتا ہے'

رمضان کا مہینہ سال بھر میں ایک مرتبہ آتا ہے اور اس میں طلوع فجر سے مغرب تک روزے کی حالت میں رہ کر اہل ایمان اپنے خالق کی عبادت بجالاتے ہیں اور اس کے حکم کی عملی اطاعت کا ثبوت دیتے ہیں' کھانے پینے سے پرہیز اور گناہ و معصیت سے اجتناب بظاہر روزے کی ظاہری علامتیں ہیں انہی علامتوں کے عملی اظہار کو "روزہ" کہا جاتا ہے لیکن قرآنی آیات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حکم روزہ کا مخصوص انداز بیان اس حقیقت کو ثابت کرتا ہے کہ یہ سب علامتیں ظاہری روزہ تو کہلا سکتی ہیں حقیقی روزہ نہیں اور حقیقی روزہ تب ہو گا جب ان سب میں "حصول تقویٰ" ملحوظ و منظور ہو' اگر حصول تقویٰ ملحوظ و منظور نہ ہو تو یہ روایتی عمل کہلائے گا جس کی خداوند عالم کے ہاں کوئی قدر و قیمت نہیں۔

عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ ماہ رمضان المبارک میں ہماری تمام تر توجہ ترک اکل و شرب پر ہوتی ہے اور اس کے ساتھ اگر کچھ زیادہ توجہ ہو تو جھوٹ' غیبت اور دیگر معاصی سے یہ کہہ کر دوری اختیار کی جاتی ہے کہ ہم روزہ سے ہیں اور یہ مہینہ خدا کا خاص مہینہ ہے اس میں معصیت کا ارتکاب صحیح نہیں' جوں ہی یہ مہینہ ختم ہوتا ہے اور عید آجاتی ہے تو گناہوں کے منتظر افراد کی عید ہو جاتی ہے وہ کھل کر بات کرتے ہیں کسی جھجک کے بغیر عمل کرتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ اب ماہ رمضان گزر گیا ہے' اب تو روزہ بھی نہیں رکھا ہوا وغیرہ وغیرہ' یہی جرات و جسارت ہی در حقیقت تقویٰ کی نفی کرتی ہے' تقویٰ کا مطلب ظاہری عبادت کے ذریعے باطنی تطہیر ہے' اگر اندر کچھ اور باہر کچھ اور ہو تو روزہ ہرگز قبول نہ ہو گا بلکہ اس کے برعکس ریاکاری کا گناہ بھی دامن گیر ہو

جائے گا۔

خداوند عالم کے احکامات و دستورات میں انسان کے لیے دنیا و آخرت کی سعادت کا راز مضمر ہے خدا کے کسی بھی حکم میں ظاہر داری یا ظاہر سازی کو ہدف قرار نہیں دیا گیا بلکہ اس کے برعکس ہر حکم کی اصل حقیقت باطنی تطہیر ہے ورنہ شیطانی عوامل تو اس حد تک انسان کی تباہی و ہلاکت کے درپے ہوتے ہیں کہ ہر عبادتی عمل میں اسے سبز باغ دکھا کر ورغلاتے ہیں اور خدا کی قربت کے حصول کی بابت ایسے افکار و توہمات پیدا کر دیتے ہیں کہ انسان اپنے عمل میں سستی کرنے لگتا ہے جبکہ حقیقت حال یہ ہے کہ خدا سے بڑھ کر کوئی بھی انسان کا خیر خواہ نہیں ہو سکتا' اس کا قرب حقیقی و باطنی و روحانی ہے وہ جسمانی قرب سے پاک و منزہ ہے کیونکہ اس کی بابت جسم و جسمانیات کا عقیدہ رکھنا خلاف عقل و فطرت اور کفر ہے' اس کی ذات جسم و مکان سے بالاتر ہے لہٰذا اس کے قرب کا مطلب جسمانی قرب ہرگز نہیں لہٰذا روزہ جو کہ قرب خداوندی کا بہترین ذریعہ اور موثر ترین وسیلہ ہے اسے حقیقی و فطری اور وجودی و روحانی قرب کا ذریعہ بنایا گیا ہے' یہی حال دیگر عبادات کا ہے کہ میں ان بھی جو قربت اور تقرب ملحوظ ہوتا ہے وہ روحانی و حقیقی اور باطنی ہے' بنا برایں روزے کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ انسان اپنے خالق کے ساتھ اس قدر قرب حاصل کرے کہ اس کی سوچ' اس کا عمل' اس کا قول و فعل خدا کی مرضی اور اس کے حکم کی تعمیل میں ہو' حقیقت یہ ہے کہ اگر ہمارے معمولات زندگی خدا کی رضاو خوشنودی کے حصول کی کوشش سے ہمرنگ ہوں تو یقیناً تطہیر باطن و تقرب الٰہی کے اسباب فراہم ہو سکتے ہیں۔

خواہشات نفس کی پیروی انسان کو تباہی کے کنارے پر لا کھڑا کرتی ہے اس کا مقابلہ صرف اور صرف خدا کی' اطاعت اور احکام الٰہی کی پیروی کے ذریعے ممکن ہے' اگر ہم روایتی انداز عمل و طرز تفکر کو ترک کر دیں اور عبادت کے اصلی و حقیقی انداز کو اپنائیں تو ہماری دنیا سعادت مند اور آخرت کامیاب ہو سکتی ہے لہٰذا ہمیں روایتی طرز عمل کو چھوڑ کر حقیقی انداز فکر و عمل اپنانا چاہیے اور خالص نیت کے ساتھ اس بات کا عہد ضروری ہے کہ ہر حکم خدا کی اطاعت' حصول تقویٰ اور باطنی تطہیر کی غرض سے انجام دیں گے' ظاہری علامتوں کی پاسداری کے ساتھ ساتھ حقیقی و باطنی معیاروں کا تحفظ بنیادی شرط ہے حقیقی عبادت گزار وہی ہے جس کا ظاہر اس کے باطن کا عکاس ہو اور اس کے عمل سے اس کی نیت و ارادہ کا پتہ چلے' روزہ بھی جن ظاہری علامتوں کا مجموعہ ہے ان میں اصل مقصد باطن کی پاکیزگی ہے' خدا کی اطاعت ہی دراصل انسان کی باطنی طہارت کی ضامن ہے۔

روزہ جسے خداوند عالم نے حصول تقویٰ کا مئوثر ترین ذریعہ قرار دیا ہے اور اس سے انسان کی باطنی تطہیر وابستہ ہے اس میں خلوص نیت اولین شرط ہے' یہ تو خدا کی عنایت ہے کہ اس نے ہمیں ان اعمال کی بجا آوری پر مامور کیا ہے جن میں ہماری ہی سعادت کی ضمانت پائی جاتی ہے' ماہ رمضان المبارک کہ جس میں خدا نے اہل ایمان کو اپنی مہمانی و ضیافت کی دعوت دی ہے رحمتوں برکتوں اور مغفرت و بخشش کا مہینہ ہے اور اس کا پاکیزہ عبادتی عمل روزہ خدا کی عنایات سے بہرہ مند ہونے کی راہ ہموار کرتا ہے اس لیے اسے ہر طرح کی آلائش سے پاک ہونا چاہیے اور اس کی ادائیگی انہی شرائط و احکام کے ساتھ کی جائے جو

خداوند عالم نے مقرر فرمادی ہیں تاکہ اس کا بنیادی مقصد اور اصل غرض و ہدف حاصل ہوسکے'

ماہ رمضان المبارک ۹۷

حج: عالمی اجتماعی عبادت

خداوند عالم نے اپنی مخلوق کو زندگی میں ایک بار اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور لوگوں کو اس ربانی بلاوے پر لبیک کہنے پر مامور کر دیا بشرطیکہ اس دعوت پر عملی لبیک کہنا ان کے مقدور میں ہو۔

حج ایک عبادت ہے ایک فریضہ ہے اور ان سب سے بڑھ کر خدا کی طرف سے اپنے بندوں کو ایک دعوت ہے کہ وہ اس کے گھر میں اس کی رحمت کا مرکز دیکھیں۔ اس کی عنایت کا ٹھکانہ دیکھیں اس کی بندگی کا مظاہرہ کریں اس کی عظمت کا نظارہ کریں اس کے گھر کے ارد گرد دیوانہ وار گھومیں اس کی محبت میں سرگرداں ہوں اس کی اطاعت میں سرگرم ہوں اور اس کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے پہاڑوں کی چوٹیوں کو سر کریں' جو بھی اس دعوت پر لبیک کہتا ہوا آئے وہ اپنی انفرادی حیثیت کو بھول جائے اجتماعی مقام و منزلت کا تحفظ کرے اور ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز کی تصویر بن جائے اس کے دل میں خالق کی اطاعت کے سوا کوئی دوسری بات نہ آنے پائے اس کے لبوں پر اللہ اکبر اور لبیک اللھم لبیک کی کفر شکن صدا بلند ہو۔

حج کس قدر پاکیزہ عمل ہے کہ اہل ایمان کو رنگ و نسل کا امتیاز یاد نہیں آتا' علاقہ و زبان کا فرق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں کرتا' نزدیک اور دور کے فاصلے محبوب کی زیارت میں رکاوٹیں کھڑی نہیں کرتے اور مادی خواہش ان کے پاؤں کی زنجیر نہیں بنتی' بلکہ صرف اور صرف زندگی کی اس سعادت کا حصول مقصود ہوتا ہے جس کے لیے دعوت دی گئی ہے' اطاعت کے جذبہ پر شباب ہوتا ہے اور انسان امید و آرزو کے بر آنے کا یقین پیدا کرلیتا ہے کیونکہ بلانے والا عظیم ہے اس کے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں وہ ہر ایک سے بے نیاز ہے سبھی اس کے محتاج ہیں اس نے سب کو بلا امتیاز اپنے گھر آنے کی دعوت دی ہے اس کی رحمت کا دسترخواں سب کے لیے بچھا ہوا ہے اس کی عنایت بلا استثنی سب پر نازل ہوتی ہے اور اس طرح آتی ہے جس طرح خشک زمین پر بارش' حج رسمی عبادت نہیں کہ جیسے ادا کرکے فارغ ہو جائیں اور پھر کچھ یاد نہ رہے بلکہ ایک دعوتی عبادت ہے' عشق و محبت سے بھری ہوئی عبادت ہے اور اس محب کا انداز محبت ہے جو بہت دور سے آئے تو محبوب اس کے لیے "تمتع" کا اعزاز بخشے اور نزدیک سے پہنچے تو "قران" کی سند سے نوازے' محبوب کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے جو بھی آئے یا یوں کہیے کہ جو بھی اس کے گھر کی زیارت کا حج یعنی ارادہ کرے تو وہ اپنی مراد کو پالیتا ہے اور پھر محبوب اسے حاجی یعنی ارادہ کرنے والا کا ایسا نام دیتا ہے جسے وہ زندگی بھر استعمال کرتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہے۔

حج کا سفر محبت کا سفر ہے عقیدت کا سفر ہے عشق کا سفر ہے اور وصل یار کا سفر ہے اس سفر میں جو بھی صعوبت درپیش ہو گراں ہی نہیں بلکہ مطلوب ہو جاتی ہے'

اب سوال یہ ہے کہ بے نیاز اور عظیم و قادر خدا نے ساری کائنات میں موجود ہونے کے باوجود ایک مخصوص جگہ کو اپنا گھر کیوں قرار دیا اور اس کی مخصوص حاضری کو لوگوں پر فرض کیوں قرار دے دیا؟ تو اس کے جواب میں کہاجاسکتا ہے کہ یہ سب کچھ بندوں کو اجتماعی حیثیت کا احساس دلانے اور اپنے قریب تر کرنے کی غرض سے کیا تاکہ سبھی لوگ ایک سمت کا تعین کرکے ادائے بندگی کریں اور اس کے گھر سے موسوم مقام پر پہنچ کر انسانی برابری کا عملی مظاہرہ کریں ورنہ وہ تو ہر جگہ اپنے بندوں کی دعائیں سنتا ہے ان کی عبادات کا مشاہدہ کرتا ہے ان کی مرادیں پوری کرتا ہے اور انہیں اپنی عنایات سے نوازتا ہے' وہ اپنی عظمت کے ساتھ دلوں کی کائنات کا حاکم ہے اس نے زندگی بھر میں صرف ایک مرتبہ اس لیے بلایا تاکہ محبت کا امتحان لے اور اپنے گھر کا نام اس لیے رکھا تاکہ لوگوں سے مانوس مخلوق اس کے بے گھر ہونے کا احساس دل میں نہ لائے بلکہ لامکان کی بے نیازی کا یقین دل میں پیدا کرتے ہوئے اپنی متاع حیات کو اس کی رضاحت کے حصول کے لیے وقف کردے۔

حج جو کہ چند مخصوص اعمال کے مجموعہ کا نام ہے اس میں خانہ خدا کا طواف حاجی کے اظہار عشق کی علامت ہے دو پہاڑیوں۔ صفا و مروہ کے درمیان تیز قدم کے ساتھ چلنا خدا کے دوست خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ حضرت ہاجرہ کے عمل کی تقلید ہے کہ جسے خدا نے اس قدر پسند فرمایا کہ قیامت تک آنے والی نسلوں کو اس کی انجام دہی کا حکم دے دیا جس سے پریشان حال محب کی دلی مرادیں پوری ہونے کی ضمانت فراہم ہو جاتی ہے' منی کے صحرا میں شب باشی اور پھر قربانی کا عمل محبت و عشق الٰہی کے فطری جذبوں کی انتہائی

صورت ہے کہ جب حاجی اپنے آپ کو اپنے حقیقی محبوب کے حکم پر فدا ہونے کی آمادگی کا اعلان کرتا ہے۔ اس دوران خدا کے مہمان کو یہ حکم ہوتا ہے کہ توحید کے اقرار کو پختہ کرنے کے لیے کفرو شرک و نفاق کے تینوں سپوتوں کو سنگسار کر دے کہ وہ شیطان ہیں اور ممکن ہے اس کی ادائے بندگی کے راستہ میں رکاوٹ بننے کی کوشش کریں لہٰذا ان پر پتھروں کی بارش کرو اور پھر جب ان سے فارغ ہو جاؤ تو ان تینوں سے زندگی بھر نبرد آزما ہونے کا عزم کرکے جاؤ۔ ان سے ہرگز مغلوب نہ ہونا ورنہ یہ تمہیں خدا کی راہ سے گمراہ کر دیں گے' خدا کے حکم کے مطابق حاجی یہ سب کچھ کرتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا محبوب اسے اس پورے دعوتی عمل کی ادائیگی پر مبارک باد دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اب خوشی مناؤ' عید کرو کہ تم نے اپنے خالق کی بارگاہ میں ادائے بندگی کا ثبوت دینے میں کامیابی حاصل کرلی بلکہ خود ہی نہیں دوسری کو بھی مبارک باد دو اور میری بارگاہ میں سجدہ ریز ہو کر دوسروں کو بتا دو کہ میں نے "بندگی" کی سند حاصل کرلی ہے' جو اس مرتبہ اس دعوت میں شریک نہیں ہوسکے ان کی توفیق کے لیے دعا کرو اور جو شریک ہونا ہی نہیں چاہتے ان کی ہدایت کی تمنا کرو کیونکہ انہیں تینوں شیطانوں نے گھیرا ہوا ہے' صرف یہی نہیں بلکہ جب وطن واپس جاؤ تو سب اپنوں کو گلے لگاؤ اور ان کو دعاؤں کی سوغات دو کہ وہ اس کی دعوت پر آسکیں کیونکہ ہر اہل ایمان کی آرزو ہے کہ وہ اپنے پروردگار کے بلاوے پر لبیک کہے' ہر محب کی خواہش ہے کہ اپنے محبوب کے گھر کا دیدار کرے اور ہر عاشق کی تمنا ہے کہ اپنے معشوق کا قرب پائے' حج سے یہ سب کچھ حاصل ہوتا ہے' خوش نصیب ہیں وہ افراد جنہیں اس ربانی دعوت پر لبیک کہنے کا عملی موقعہ ملتا ہے'

زندگی کی اس عظیم سعادت سے بہرہ ور ہونے کی توفیق حاصل ہوتی ہے اور ادائے عشق کے اسباب فراہم ہو جاتے ہیں' یقیناً برکتوں والا وہ گھر' عظمتوں والا وہ گھر اور پاکیزہ نسبتوں والا وہ گھر کہ جسے دو عظیم نبیوں نے تعمیر کیا اس کی زیارت اس کا دیدار' اس کا طواف اور اس کے قریب اور قریب تر پہنچ کر اس کا لمس روح کو سرور' دل کو سکون اور یقین کو پختگی عطا کرتا ہے' ورنہ یہ دنیا تو گناہوں کا گھر ہے خدا کی نافرمانیوں کی بستی ہے' معصیت کا گھر ہے اس میں رہ کر شیطانی وسوسوں سے دوری خدا کی خاص عنایت کا نتیجہ ہے' دنیا کا حسنؑ و جمال انسان کو دھوکہ دیتا ہے دنیا کی دلکش ادائیں انسان کو گمراہ کر دیتی ہیں اور دنیا اپنی دنیت و پستی کے ساتھ انسان کی تخلیقی بلندی کو خاک میں ملا دیتی ہے کہ اس سے بچنے کے لیے مضبوط ارادے' عزم بالجزم' عمل اور پختہ عمل کی ضرورت ہے جو کہ توفیق خداوندی کے بغیر ہرگز ممکن نہیں' توفیق کا حصول جن شرائط سے وابستہ ہے ان میں انسان کے اپنے ارادہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے کیونکہ خدا کسی پر جبر نہیں کرتا وہ انسان کی سعادت و ابدی حیات کا خواہاں ہے بشرطیکہ انسان خود ہی عملی طور پر اس کا خواہاں اور خدا کی ہر دعوت پر کہے لبیک اللھم لبیک۔

انقلاب ذریعہ ہے مقصد نہیں

عام طور پر تصور کیا جاتا ہے کہ انقلاب ہدف ہے' مقصد ہے مگر ایسا ہرگز نہیں' انقلاب ذریعہ ہے مقصد نہیں' ہدف تک پہنچنے کا وسیلہ ہے ہدف نہیں۔

انقلاب کا جذبہ' خواہش' تمنا' احساس یا کوشش ہر شخص کا فطری حق ہے۔ اس وقت دنیا کے جس ملک اور علاقہ پر نظر کریں۔ ہر قوم' ہر فرد انقلاب کی بات کرتا ہے' کہیں سیاسی انقلاب کی خواہش ہے تو کہیں معاشی و اقتصادی انقلاب کی تمنا' کہیں سماجی انقلاب کی آرزو ہے تو کہیں معاشرتی انقلاب کی چاہت' کہیں اخلاقی انقلاب مطلوب ہے تو کہیں علمی انقلاب مقصود ہے۔ کہیں صنعتی انقلاب کا مطالبہ ہے تو کہیں سائنسی انقلاب کی بات ہو رہی ہے۔ غرض یہ کہ ہر قوم و ملت اور ہر فرد اپنے مخصوص شعبے اور مورد میں انقلاب کا خواہاں ہے۔ کوئی بھی اپنی موجودہ حالت سے مطمئن نظر نہیں آتا کسی نہ کسی حوالے سے انقلاب کی تمنا ہر شخص کے دل میں پائی جاتی ہے۔

یہ بات تو واضح ہے کہ ہر شخص انقلاب کا متمنی ہوتا ہے لیکن سوال یہ

ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اور اس کا سبب اور پس منظر کیا ہے؟ اور اس کا حل کیا ہے؟۔

اگر ہم عالمی حالات و واقعات پر نگاہ کریں تو ہمیں انقلاب کا جواز نظر آتا ہے۔ انقلاب کی آرزو بجا معلوم ہوتی ہے کیوں کہ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کی طبیعت میں تخلیقی و تکوینی طور پر تبدیلی و تغیر کی حس ہمیشہ اور ہر آن موجزن رہتی ہے اور معاشرتی زندگی کے حالات اس کی اس حس کو زندہ رکھنے میں مئوثر کردار ادا کرتے ہیں چنانچہ جس کا تعلق کسی بھی شعبہ حیات سے ہو اسے معروضی حالات' تبدیلی و انقلاب کا ہر لمحہ احساس دلاتے رہتے ہیں کیوں کہ فطری طور پر ایک ہی حالت پر باقی رہنا بھی اس پر گراں گزرتا ہے۔

جو شخص انقلاب و تبدیلی کا خواہش مند ہوتا ہے' وہ شعوری و لاشعوری طور پر اس حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے کہ انقلاب اس کی منزل نہیں بلکہ راستہ ہے' مقصد نہیں بلکہ مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ ہے' ہدف نہیں بلکہ ہدف کے حصول کا وسیلہ ہے چنانچہ وہ راستہ پر چل کر منزل تک پہنچنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ اس ذریعہ کو اپناکر مقصد کے حصول کا متمنی ہوتا ہے' اس وسیلے کو اختیار کرکے ہدف تک پہنچنے کا آرزومند ہوتا ہے' اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو رات کی تاریکی سے تنگ آکر دن کی روشنی کا خواہاں ہوتا ہے تاکہ اس سے سکون حاصل کرسکے اور جب دن آجاتا ہے تو اس کی ابتداء اس لیے اچھی لگتی ہے کہ ابھی تبدیلی کی طلب دل میں موجزن ہوتی ہے لیکن اگر دن لمبا ہو جائے تو وہ اکتا جاتا ہے اور پھر آرام کے لیے رات کے آنے کی خواہش اس کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے تاکہ اس کے ذریعے سکون حاصل کرسکے۔ اسی طرح انسان کی زندگی

میں تبدیلی کی خواہش کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

انسان کی انقلاب و تبدیلی کی خواہش کا پس منظر اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ سکون کا طالب ہے' اس کو آرام و اطمینان کی ضرورت ہوتی ہے' امن و سلامتی سے بہرہ مند ہونا چاہتا ہے' اضطراب و بے چینی کو ختم کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔ بنابرایں امن و سکون کا متلاشی انسان انقلاب کا خواہاں ہوتا ہے' فطری طور پر اس کی یہ خواہش ہر لمحہ اس کی وجودی قوتوں کو متحرک رہنے کی دعوت دیتی ہے۔

خداوند عالم نے انسان کے وجود میں جن متضاد قوتوں کو خلق فرمایا ہے وہ اسے ایک حالت پر باقی رہنے نہیں دیتیں بلکہ اس کے ارادے پر چھا جاتی ہیں اور اس کے احساس پر غلبہ کر لیتی ہیں جس کے نتیجے میں وہ تبدیلی کا راستہ دیکھنے لگتا ہے۔ انقلاب کی خواہش کرتا ہے اور اپنی موجودہ حالت کے بدلنے کا منتظر ہو جاتا ہے۔ اس کی آرزوئے انقلاب اور تمنائے تبدیلی اس کے وجود میں پائے جانے والے اضطراب کی جگہ سکون و اطمینان کے حصول کا سبب ہوتی ہے۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انقلاب ذریعہ ہے مقصد نہیں۔ انقلاب کا خواہاں انسان خواہ اس کا تعلق کسی بھی شعبہ حیات سے ہو وہ انقلاب کو اپنی منزل ہرگز نہیں سمجھتا بلکہ وسیلہ قرار دیتا ہے اور اگر وہ اسے منزل تصور کر لے تو انقلاب اس کی موجودہ حالت کے خاتمہ میں کردار تو ادا کر سکے گا مگر اسے مطلوب نہ مل پائے گا اور وہ پھر کسی دوسرے انقلاب کا طلبگار ہو گا اور یہ سلسلہ لامتناہی ہو جائے گا جو کہ بے فائدہ و بے معنی ہے۔

(جولائی ۱۹۹۶ء)

بعثت نبوی ؐ کے مقصد سے بغاوت

خداوند عالم نے جہالت و جاہلیت کی تاریکی میں ڈوبی ہوئی مخلوق کو راہ راست پر لانے اور علم و آگاہی کی روشنی عطاء کرنے کے لیے اپنا آخری نبی ؐ بھیجا اور اس کی بعثت کو بنی نوع انسان کے لیے اپنی طرف سے احسان عظیم قرار دیا' چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا:

"لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلٰى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِنْ اَنْفُسِهُمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ آيٰاتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِى ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ" ---- سورئه آل عمران' ۱۶۴)

(خدا نے اہل ایمان پر احسان کیا کہ ان میں ایک رسول ؐ کو بھیجا جو انہی میں سے ہے جو ان کے سامنے خدا کی آیات کی تلاوت کرتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے جبکہ وہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔)

حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ۲۷ رجب المرجب کو ہوئی۔ اس

وقت آپ کا سن مبارک چالیس سال کا تھا۔ آپ ؐ کی بعثت یعنی امر رسالت پر مامور ہونے کا مقصد انسانیت کی فلاح و صلاح کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ توحید کے سائے میں پاکیزہ زندگی بسر کرنے کا راستہ دکھانا اور مخلوق کو خالق کی اطاعت کے فریضہ کی یاد آوری ہی آپ ؐ کا مقصد بعثت تھا' آپ سے قبل خدا کی طرف سے بھیجے گئے کثیر تعداد میں انبیاء و مرسلین علیہم السلام لوگوں کو خدا کا راستہ دکھلا کر اس پر چلنے کی ہدایت کرکے چلے گئے' خداوند عالم نے آنحضرت ؐ کو نبوت کی خاتمیت کا تاج پہنایا اور قیامت تک آنے والی نسلوں کی ہدایت کی ذمہ داری آپ ؐ کے سپرد کی' جسے آپ ؐ نے بخوبی ادا کیا۔

حضرت پیغمبر اسلام ؐ نے دکھی انسانیت کو نجات کا راستہ دکھایا' انسان کو شیطان کے وسوسوں میں نہ آنے کی تاکید کی' ظلم و جبر کے سائے میں زندگی گزارنے والوں کو عدل و امن کا پیغام و حکم دیا خود ساختہ خداؤں کو چھوڑ کر حقیقی خدا کے حضور سجدہ ریز ہونے کی راہنمائی کی' معاشرے میں باہمی حقوق کے احترام کا قانون نافذ کیا' کسی کو کسی پر برتری حاصل ہونے کے جھوٹے معیاروں کی نفی کرتے ہوئے تقوی و پرہیزگاری کو فضیلت کا حقیقی معیار قرار دیا' عربوں کے جاہلانہ افکار کی اصلاح کے لیے آیات الہیہ کے ذریعے علم و معرفت کی روشنی بکھیری۔ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو حریت و آزادی کی راہ دکھائی اور بالاخر آمریت کے مقابلے میں آدمیت کی فطری قوتوں کو متحرک کیا۔

حضرت پیغمبر اسلام ؐ کو جس تاریک دور میں انسانوں کی ہدایت کی ذمہ داری سونپی گئی' وہ تاریخ بشریت کا بدترین دور تھا مگر آپ ؐ نے اپنے برحق مئوقف اور پاکیزہ کردار و حسن اخلاق کے ساتھ محفل بشریت میں شمع توحید روشن

کر دی۔ آپ کی بدولت خداوند عالم نے آپ ؐ کی امت کو سابقہ تمام امتوں پر برتری عطاء فرمائی تاکہ آنحضرت ؐ کے ساتھ نسبت کے مقدس رشتہ کا فیض امت کو حاصل ہو سکے مگر افسوس کہ مسلمان اپنے محسن و شفیق رہنما کی تعلیمات کو بھول گئے۔ انہوں نے رحمان کا راستہ چھوڑ کر شیطان کی پیروی کرلی اور اپنے اس اعزاز کو عملی طور پر نظرانداز کر دیا کہ خدا نے انہیں سب سے افضل نبی ؐ کی امت ہونے کا شرف بخشا ہے مسلمانوں نے بعثت نبوی ؐ کے مقصد اعلیٰ سے بغاوت کرلی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے ہوئے رہنما اصولوں سے منحرف ہو گئے چنانچہ اس وقت مسلمانوں کی حالت زمانہ جاہلیت کے لوگوں سے بدتر ہے کیوں کہ ان میں بد عملی و بدکرداری کی عادات دور جاہلیت سے زیادہ پائی جاتی ہیں' وہ اخلاقی پستیوں کا شکار ہیں اور انسانی معیاروں کو پامال کرنے میں مصروف ہیں۔ زبان پر کلمہ توحید مگر عمل میں کئی خداؤں کی پرستش ہوتی ہے جن میں سرفہرست ہوائے نفس ہے۔ جس کی پوجا نے انسان کو انسان کا قاتل بنا دیا ہے۔ دنیا میں کہیں امن نہیں' عدل نہیں' سکون نہیں' مسلمان اپنا قومی و ملی تشخص کھو رہے ہیں اور عملی طور پر کفار و مشرکین کے ہاتھوں کھلونا بن چکے ہیں تو آیا یہ سب کچھ بعثت نبوی ؐ کے مقصد اعلیٰ سے بغاوت نہیں؟۔ حضرت پیغمبر اسلام ؐ نے جن اصول حیات کی رہنمائی فرمائی تھی' ان میں جھوٹ' غیبت' دھوکہ' معصیت' رشوت' آمریت اور انسانی حقوق کی پامالی کو کبیرہ گناہوں میں شمار کیا گیا مگر اب اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والے انہی گناہوں کا ارتکاب کرکے اپنی آخرت تباہ کر رہے ہیں۔ دولت و ثروت کی غیرعادلانہ تقسیم' اقتدار کی مسند پر بیٹھ کر تکبر کے ساتھ غیراعلانیہ طور پر خدائی کا عملی دعویٰ اور دوسروں پر برتری

پانے کے شیطانی احساس کی تکمیل کیا خدا کے آخری رسولؐ کے مقصد رسالت سے بغاوت نہیں؟۔ کیا مسلمان بھائیوں کے مقابلے میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی کے رشتے استوار کرنا خدا کے دین و آئین اور نبیؐ کی شریعت سے بغاوت نہیں؟۔ بعثت نبویؐ کے مقصد اعلیٰ سے بغاوت کا نتیجہ دنیا میں ذلت و خواری اور آخرت میں تباہی و جہنم کے سوا کچھ نہیں۔

(بموقعہ بعثت نبویؐ)

دنیا: کھیل کود کا گہوارہ

سچ ہے کہ دنیا کھیل کود کا گہوارہ ہے۔ آج ہر طرف کھیلوں کے فروغ کے لیے کس قدر اہتمام ہو رہا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ تقریباً" ہر ملک میں ایک مستقل وزارت قائم کی جاتی ہے جسے وزارت کھیل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور اس کا بجٹ بھی عام طور پر کسی دوسری اہم ترین وزارت سے کچھ کم نہیں ہوتا۔

کھیل درحقیقت تفریح کے حوالے سے مستحسن عمل ہے نہ تو کوئی مذہب اس سے منع کرتا ہے اور نہ ہی کوئی معاشرہ و قانون' کیونکہ تفریح انسانی طبع کے لیے نہایت ضروری ہے خاص طور پر جب کہ موجودہ مادی دور میں مشکلات و مسائل کی زنجیروں نے بنی نوع انسان کو جکڑ رکھا ہے اور اس کے نتیجے میں اخلاقی و نفسیاتی بیماریاں پیدا ہو چکی ہے۔ ذہنی طور پر ہر شخص کسی نہ کسی حوالے سے نجی یا معاشرتی زندگی میں سخت پریشانی کا شکار ہے اور تفریح یقیناً" ایک ایسا عمل ہے جس سے کئی امراض دور ہو جاتے ہیں بلکہ عام طور پر اطباء بھی مریضوں کو دواؤں کے استعمال کے ساتھ ساتھ بدنی تفریح کی زیادہ تاکید کرتے

ہیں۔ اگر کھیلوں کو جسمانی ورزش ہی تک محدود رکھا جاتا اور اس میں دیگر اغراض شامل نہ کی جاتیں تو اس سے بہتر کوئی چیز نہ تھی لیکن اب صورت حال کچھ مختلف ہے' کھیلوں کی بابت زیادہ تر اقتصادی و سیاسی عوامل کار فرما ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں تفریح کا اصل مقصد حاصل نہیں ہوتا۔

ہر سال عالمی سطح پر کھیلوں کے مقابلے کا اہتمام اور اس پر خرچ کئے جانے والے بجٹ کا جائزہ لیں اور پھر کھیل کے تماشائیوں کے لیے عیاشی کے پروگراموں کو دیکھیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کھیل کا اصل مقصد ملحوظ نہیں اور پھر سٹہ بازیاں وغیرہ جلتی پر تیل کا کام دیتی ہیں۔ ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے کی بات ہے کہ فرانس میں فٹ بال کا عالمی مقابلہ ہوا' اس میں جو مناظر دیکھنے میں آئے اس سے پہلے کسی عالمی کھیل مقابلے کی نسبت زیادہ نہیں تھے' صرف کیفیت و نوعیت مختلف تھی نہ تو ضابطہ اخلاق کی پابندی ہوتی ہے اور نہ ہی تفریح کا اصل مقصد پیش نظر رہتا ہے۔ ٹیمیں ایک دوسرے پر برتری کو انا کا مسئلہ بنا کر میدان میں آتی ہیں اور تماشائی بھی اسی جذبے اور جوش کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ تماشائیوں کے مخلوط مجمع میں غیر اخلاقی حرکات ٹی وی پر دکھائی جاتی ہیں اور پھر ایک طویل عرصے تک جیتنے اور ہارنے والوں کے بارے میں مثبت و منفی تبصرے جنگ و عناد کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ عالمی سطح پر منعقد ہونے والے مقابلوں میں ہر قوم و ملک سے آئے ہوئے لوگ آپس میں محبت اور برادری کی بجائے دشمنی اور نفرت کی سوغات لے کر جاتے ہیں جب کہ ہونا تو یہ چاہیے کہ ان عظیم عوامی اجتماعات میں قوموں کا باہمی میل جول مزید بڑھتا اور دوستی اور انسانیت کے حوالے سے ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے مگر ایسا ہرگز نہیں

ہوتا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ عالمی سیاسی تاجروں نے کھیل جیسے پاکیزہ عمل کو اپنے مادی اور اقتصادی مفادات کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے جس سے اخلاقی قدریں بھی متاثر ہو رہی ہیں۔ ایسے حالات میں ارباب دانش و اہل فکر و نظر کو سوچنے کی ضرورت ہے اور صاحبان اقتدار کھیل کے اصل مقصد کو زندہ کرنے کے لیے اقدامات کریں۔ نت نئے کھیلوں میں ایجادات بھی تفریح کے اصل ہدف کو پورا نہیں کرتیں بلکہ کھلاڑیوں کی جسمانی تربیت کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت بہت ضروری ہے کیونکہ ہر کھلاڑی اپنے ملک و قوم کا نمائندہ ہوتا ہے اس کی ہر حرکت اور سکون پوری قوم کے نام لکھی جاتی ہے۔

فرانس میں منعقد ہونے والے عالمی مقابلے میں ایران اور امریکہ کے درمیان فٹ بال کا جو میچ ساری دنیا نے دیکھا اور ایران کو امریکہ پر برتری حاصل ہونے پر اسلامی و غیر اسلامی قوموں اور ملکوں میں اس پر تبصرہ اور رد عمل بھی ہوا اور اسے جسمانی تفریح کی بجائے سیاسی رنگ دینے کی بھرپور کوششیں کی گئیں۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کھیل کے اصل مقصد کی بجائے دیگر عوامل ملحوظ ہوتے ہیں۔ یہی صورت حال پاک و ہند کے درمیان کھیلے جانے والے کسی بھی میچ میں دیکھنے میں آتی ہے۔ چونکہ دونوں ممالک روایتی حریف اور ان کے کھلاڑیوں میں بھی وہی احساس و جذبات پائے جاتے ہیں جو عوام اور سیاست دانوں میں ہیں جبکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ تفریح کو تفریح کے تناظر میں دیکھا جائے نہ کہ علاقائی و اعتقادی اور سیاسی حوالوں سے' بہرحال کھیل کے اصل مقصد کو نظر انداز کرنے سے دنیا نفرتوں کا بازار تو بن سکتی ہے محبتوں کا

گلزار نہیں۔

عالمی مقابلوں کے ساتھ ساتھ علاقائی حوالوں سے بھی کھیلوں کے فروغ کو تفریح کے اصل مقصد سے ہم آہنگ کرنا چاہیے۔ دین اسلام کی اخلاقی قدریں ہمیں زندگی کے تمام شعبوں میں اعتدال اور عاقلانہ روش اپنانے کی دعوت دیتی ہیں اگر ہم اپنے کھلاڑیوں اور زندگی کے دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والوں کو اسلام کی اعلیٰ اخلاقی قدروں کے اپنانے کی تلقین کریں تو بدنی اور جسمانی تفریح کے ساتھ ساتھ روحانی و اخلاقی حوالوں سے بھی بھرپور فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

(بموقعہ عالمی کھیل مقابلہ - فرانس ۱۹۹۸ء)

تذکرہ بی بی سیدہؑ کا

حضرت فاطمتہ الزہراءؑ، پیغمبر اسلامؐ کی دختر ہونے کے حوالے سے اپنا مخصوص مقام رکھتی ہیں لیکن اس نسبی و خاندانی عظمت کے ساتھ ساتھ ذاتی کمالات کے تناظر میں دیکھا جائے تو سیدہ کونین منفرد شخصیت کی حامل نظر آتی ہیں۔ عبادت کے حوالے سے تواریخ نے سیدہ کے متعلق واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ مدینہ منورہ کی خواتین اس بات کی گواہی دیتی تھیں کہ آپ سے زیادہ عبادت گزار اور زہد و تقویٰ کی حامل کسی خاتون کو نہیں دیکھا گیا، تعلیم و تربیت کے باب میں حضرت فضہ جیسی کنیز کو دیکھیں کہ سیدہ کے درس سے فیض یاب ہو کر ۲۰ سال تک قرآنی آیات کے علاوہ کوئی بات نہیں کی۔ ہر بات کا جواب اور ہر چیز کا اظہار قرآنی آیتوں سے کرتی تھیں۔

گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ حضرت فاطمہؑ نے جہاد کی بابت قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ جنگ احد میں آنحضرتؐ کے زخموں کا علاج کیا۔ جنگ خندق کے موقع پر سالار سپاہ کے لیے غذا کا انتظام کیا۔ فتح مکہ کے عظیم واقعہ میں شریک ہوئیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آخری حج ادا کیا تو بی بی آپؐ کے ساتھ شریک سفر تھیں۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت علیؑ کے ساتھ مل کر اسلامی خدمات کا مظاہرہ کیا۔ ان تمام حوالوں سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیدہ کونینؑ تاریخ کی منفرد شخصیت تھیں اور جہاں تک بی بی کے اجتماعی و

معاشرتی اور انسانی مقام و منزلت کا تعلق ہے تو اس میں کسی طرح سنے شبہ کی گنجائش نہیں کہ نبوت کے سایہ عنایت میں پلنے والی بی بی نے صنف نازک کی تخلیقی عظمتوں کو اپنے کردار و جذبہ انسانی کی روشنی میں اس طرح ظاہر کیا کہ علوم انسانی کے ماہرین ان قدروں کو ہمیشہ اپنا سرمایہ علم و تحقیق قرار دیتے رہیں گے جو بی بی فاطمتہ الزہراء نے اپنی نہایت مختصر زندگی میں قائم کیں۔ بیٹی کی حیثیت میں والدین کے حقوق کا احترام جس انداز میں حضرت فاطمہؑ نے کرکے دکھلایا اس سے انسانی حقوق کی معراج سامنے آجاتی ہے اور ماں کی حیثیت میں حسنؑ اور حسینؑ اور زینب صغریٰ زینب کبریٰ جیسی عظیم اولاد کی فکری و عملی تربیت کرنے کا جو واضح ثبوت آپ نے دیا اس کے نتیجے میں آج اسلام اور دین کی مقدس تعلیمات کو بقا حاصل ہے کہ اگر یہ ہستیاں نہ ہوتیں تو آج دین و انسانیت کا نام و نشان باقی نہ ہوتا اور یہ سب سیدہ کونینؑ کی پاکیزہ تربیت کے مقدس آثار میں سے ہے کہ ماں اور بچوں کے حقوق کی مستحکم عملی بنیاد قائم کر دی تاکہ نسل انسانی اس حوالے سے تشنہ مثال نہ رہ جائے۔ شریک حیات ہونے کے ناطے سیدہ فاطمہ زہراء نے امیر المومنین علی علیہ السلام کے ساتھ پاکیزہ محبت و خلوص اور مقدس دوستی و وفا کے آئینے میں مثالی ازدواجی زندگی کا عملی نمونہ پیش کرکے قیامت تک آنے والی نسلوں کو خوش حالی اور خوشگوار زندگی بسر کرنے کا اصول بتا دیا اور مادی خواہشات کو معنوی اور روحانی پاکیزگی کے ساتھ یکجا کرکے پورا کرنے کا ایسا ضابطہ عطاء کیا کہ حقوق کے باہمی احساس میں کمی بھی نہ آنے پائے اور زندگی کی پاکیزگی سے صحیح معنے میں لطف اندوز ہو سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک تاریخ نگاروں نے سیدہ کے حوالے سے ایک

مخلص و باوفا شریک حیات کے سوا کسی بھی ایسے امر کی نشاندہی ہی نہیں کی جس سے آپ کی روحانی عظمت اور ایک عورت ہونے کے ناطے کسی لحاظ سے نقص و کمزوری کا اشارہ مل سکے بلکہ سیدہ کی عظمت کا اظہار یا ذاتی کمالات کا اعتراف حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد گرامی سے ہوتا ہے کہ ''اگر علیؑ نہ ہوتے تو فاطمہؑ کا ہمسر ہی کوئی نہ تھا''

۲۰ جمادی الاول ۵ بعثت کو سیدہ کی ولادت ہوئی۔ محسنہ اسلام حضرت خدیجہ جیسی عظیم ماں کی آغوش میں پلنے والی بی بی فاطمہ زہرا اسلام کی عظمت کا پرچم اپنے کردار کے شانوں پر بلند کر کے دنیا والوں کو حقوق کے تحفظ کا عملی درس دیتی رہیں اور بالآخر اپنی معاشرتی، اخلاقی، انسانی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے ۱۱ھ کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔

سیدہ کونینؑ کی زندگی خواتین عالم کے لیے نمونہ عمل ہے۔ اگر سیدہ کی پاکیزہ حیات کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے تو خلوص و محبت اور وفا و صداقت سے بھری ہوئی زندگی کا جو نمونہ آپ نے پیش کیا اس کا ایک فی صد بھی امت اسلامیہ کی خواتین اپنا لیں تو کسی حوالے سے ناکامی کا شکار یا پریشانی میں مبتلا نہیں ہو سکتیں۔ حقوق کے حصول کی عملی جنگ سیدہ معصومہ فاطمہ زہراء نے جس انداز میں لڑی، وہ حق کے دفاع اور حقوق کے تحفظ کی بابت مشعل راہ ہے۔

حضرت فاطمۃ الزہراء کی سیرت و کردار کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اسلام کی ارفع و اعلیٰ تعلیمات میں زندگی کی جن پاکیزہ و ابدی حقیقتوں کے حصول کی رہنمائی کی گئی ہے، وہ تمام سیدہ کے مقدس وجود میں پائی جاتی تھیں۔

حق کے حصول اور تحفظ کے لیے تاریخ نے سیدہ فاطمہ زہرا کا جو جرات مندانہ اقدام ہمارے سامنے پیش کیا ہے اس سے خاندانی عظمت اور ذاتی فضیلت کی خوشبو پوری دنیائے انسانیت میں پھیلی ہوئی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ سیدہ نے اپنی نہایت مختصر زندگی میں سخت ترین حالات کا سامنا کیا۔ مصائب اور تکالیف سے گزریں، عظیم و شفیق باپ کی جدائی، مخلص شریک حیات کی مظلومیت اور اپنے مسلمہ حقوق سے محرومی ایسے مصائب کے پہاڑ رسول زادی پر ٹوٹے مگر استقامت اور بہادری کے ساتھ تمام حالات کا مقابلہ کیا۔ اگر حالات کی تلخی کا شکوہ بھی کیا تو صرف اپنے پروردگار کے حضور، اگر اپنی مصیبتوں پر غمگین ہوئیں تو صرف تنہائی میں آنسو بہاکر اپنے آپ کو سنبھالا لیکن کسی صورت میں بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

حضرت فاطمتہ الزہراء نے صنف نازک کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام افراد انسانیت کے لیے ہدایت و سعادت کے چراغ روشن کئے اور رہتی دنیا تک آنے والی نسلوں کو خدا پر بھروسہ کرنے اور دنیا کی تکلیفوں میں خالق کی طرف رجوع کرنے کا عملی درس دیا۔ سیدہ کی تعلیمات اور عملی ہدایات سے خدا کے تقرب اور کامیاب و سعادت مند زندگی بسر کرنے کے زریں اصولوں کی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

ہمارا سلام ہو سیدہ کی عظمت کردار پر اور کمال عصمت پر!

(بموقعہ ولادت حضرت فاطمہ زہراءؑ ۱۹۹۷ء)

حضرت علیؑ: سب سے پہلے شہید محراب

(خصوصی تحریر بمناسبت شہادت حضرت علیؑ)

حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام تاریخ انسانیت کی وہ عبقری شخصیت ہیں جنہوں نے آغوش نبوت میں پرورش پائی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سایہ عنایت میں پروان چڑھے، مکتب رسالت سے علم و عرفان کی دولت حاصل کی، زبان وحی سے باب مدینہ کا خطاب پایا اور بالاخر اپنی پاکیزہ زندگی کے آخری لمحہ میں یہ الفاظ ورد زبان کئے: مجھے کعبہ کے پروردگار کی قسم! میں کامیاب ہوگیا۔

حضرت امیرالمومنین علیؑ تاریخ کی وہ منفرد شخصیت ہیں جنہیں پہلے اور آخری مولود کعبہ ہونے اور پہلے اور آخری شہید محراب ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔ مئورخین نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ یہ اعزاز آپ ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ (ملاحظہ ہوں حوالہ جات مستند! مروج الذھب مسعودی۔ اثبات الوصیہ۔ سیرۃ الخلفاء عبدالحمید دہلوی) اہل سنت والجماعۃ کے مقتدر محدثین اور مستند مئورخین نے واضح طور پر حضرت علی کی ولادت درخانہ کعبہ کو انہی جناب سے مختص فضیلت قرار دیا ہے۔ اسی طرح شہید مسجد ہونے کا امتیازی وصف بھی

آپ ہی کو حاصل ہوا۔ اسی مطلب کو شاعر نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

کسے را میسر نشد ایں سعادت
بہ کعبہ ولادت بہ مسجد شہادت

(کسی کو بھی یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی کہ کعبہ میں ولادت اور مسجد میں شہادت پائی ہو)

سچ ہے کہ کردار اپنی زبان سے اپنا اظہار کرتا ہے' کمالات بولتے ہیں اور فضیلتیں کاشانہ وجود کو روحانی روشنی سے منور کرتی ہیں' صدر اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ کفار و مشرکین نے کلمہ توحید کے فروغ سے خوفزدہ ہوکر اپنے تمام تر وسائل بروئے کار لاتے ہوئے اخلاقی' معاشرتی' اقتصادی و عسکری قوتوں سے استفادہ کیا تاکہ یکتا پرستی کے فطری مشن کو ناکام نہ سہی تو کم از کم اس کے پھیلاؤ میں کمی لائی جائے مگر درسگاہ رسالت کے تربیت یافتہ علم و معرفت کے سپوتوں نے ان کی ہر کوشش ناکام بنا دی اور ہر میدان میں ان کا مقابلہ کرکے تثلیث و بت پرستی کے مقابلے میں توحید و خدا پرستی کے مقدس عقیدہ کی عملی و علمی پاسداری کا فریضہ ادا کیا۔ اس سلسلے میں جو بلند پایہ' ہستیاں ہراول دستہ میں شامل تھیں' ان کے سربراہ حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالب تھے کہ جنہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو "اَنَا عَبْدُ مِنْ عَبِیْدِ مُحَمَّدٌ" (میں محمدؐ کے غلاموں میں سے ایک غلام ہوں) کے نام سے یاد کیا۔

حضرت علیؑ کے علم و حکمت اور معرفت و ادب کے جواہر پارے آج بھی اپنی نمایاں حیثیت کے ساتھ تشنگان حقائق کی دسترس میں ہیں۔ آپ کے خطبات'

خطوط و حکیمانہ ارشادات کا مجموعہ نہج البلاغہ آپ کے علمی کمالات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ توحید کی حقیقت اور ذات کردگار کی معرفت کی بابت آپ کے بیانات عظیم علمی حقائق پر مشتمل حکمت الہیہ کے خزانے ہیں۔ ادبی حوالے سے آپ کے دو خطبے اپنی مثال آپ ہیں کہ جن میں امام علیہ السلام نے الف اور نقطہ کے بغیر کلام کیا جب کہ ابجد میں یہ دو حرف ایسے ہیں کہ جن کے بغیر کلام میں حسن و لطافت مفقود ہوتی ہے مگر حضرت امیرالمومنین نے جس فصاحت و بلاغت کے ساتھ ان دونوں کے بغیر خطبے ارشاد فرمائے' اس کا جواب آج تک کوئی نہیں لا سکا۔

حضرت عمر بن خطاب کا ارشاد ہے کہ ایک دن میں نے علی ابن ابی طالب سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ آپ ہر سوال کا جواب فورا" اور سوچنے پر وقت صرف کئے بغیر دے دیتے ہیں؟۔ تو حضرت علی نے جواب دیا کہ میں ابھی آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں' اس کا جواب ہی میرا جواب ہوگا۔ حضرت عمر نے فرمایا: یا علی! پوچھئے؟۔ حضرت علیؑ نے فرمایا: آپ میرے ہاتھ کو دیکھیں اس کی کتنی انگلیاں ہیں؟۔ حضرت عمر نے جواب دیا: پانچ' آپ نے فرمایا کہ آپ نے فورا" اور بغیر سوچے جلدی ہی کیونکر جواب دیا ہے؟۔ حضرت عمر نے کہا یہ بھی کوئی سوچنے والی بات ہے' یہ تو واضح ہے اور سامنے نظر آ رہی ہیں۔ حضرت علی نے فرمایا کہ جس طرح یہ ہاتھ کی پانچ انگلیاں سامنے ہیں اور نظر آ رہی ہیں کہ ان کے بارے میں مزید غور و فکر کی ضرورت نہیں ہوتی اسی طرح مجھے جو علم حضرت رسول اللہ ﷺ نے عطاء فرمایا ہے اس کی وجہ سے پوری کائنات کی حقیقتیں بھی میرے سامنے ہاتھ کی پانچ انگلیوں کی مانند ہیں کہ جن کی بابت مزید کچھ سوچنے کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوتی۔ اس کے بعد حضرت علیؑ نے فرمایا کہ مجھے حضرت رسالت مابؐ نے اس طرح علم کی غذا

دی ہے جس طرح پرندہ اپنے بچے کو دانہ کھلاتا ہے۔

حضرت عائشہ سے روایت کی گئی ہے آپ نے فرمایا کہ کوئی فضیلت اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک کہ ولایت علی ابن ابی طالب کا اقرار اس میں شامل نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مکتب رسالت کے اس عظیم شاگرد نے دنیا کو علم و حکمت کے جو خزانے عطاء کئے ہیں ان میں عصر حاضر کی ترقی یافتہ سائنس کی تحقیقی ایجادات کا اصولی ذکر موجود ہے۔ پانی سے بجلی پیدا ہونے' فضا و آسمانوں کے راستوں' ہوا کے وزن' پہاڑوں کا ثقل' انسانوں اور حیوانات و پرندوں کی تخلیق کے رموز و اسرار' حفظان صحت کے بنیادی اصول اور آخری زمانہ کی غیبی خبروں کے علاوہ کائنات کی ابتداء اور مرحلہ بہ مرحلہ اس کا ارتقاء وغیرہ تمام حقائق کا تفصیلی بیان حضرت علیؑ کے ارشادات و خطبات میں پایا جاتا ہے۔ اسی لیے آپؑ مسجد کوفہ میں خطبہ دیتے ہوئے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "جو چاہو مجھ سے پوچھو میں تمہیں آسمان کے راستوں کی بابت زمین کے راستوں سے زیادہ معلومات دوں گا کیوں کہ میرا سینہ علم کا خزینہ ہے۔ میں نے رسول اللہؐ کا لعاب دھن چوس چوس کر حکمت و معرفت کے بیش بہا جواہر پائے ہیں۔

قرآنی حقائق و معارف کے بارے میں حضرت علیؑ کا مشہور ارشاد گرامی ہے کہ میں قرآن مجید کی ہر آیت کے ظاہری و باطنی معانی سے آگاہی رکھتا ہوں' ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے اور ہر باطن کے ستر باطن ہیں اور پھر ان میں سے ہر باطن کے ستر باطن ہیں۔ میں اس کے ہر ہر باطن کا علم اسی طرح رکھتا ہوں جس طرح آیت کے ظاہر کا علم رکھتا ہوں۔ کاش کوئی مجھ سے یہ سب علوم و معارف حاصل کرے۔

علم و معرفت کے ساتھ ساتھ عبادت و بندگی پروردگار میں حضرت امیرالمومنین کے کمال خضوع و خشوع اور تقوی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ آپؑ کے پاؤں میں کانٹا لگا تو حضرت رسالت مابؐ نے فرمایا: "جب علیؑ سجدہ میں جائیں تو ان کے پاؤں میں پیوست کانٹے / تیر کو نکال لینا کیونکہ جب علیؑ عبادت میں مصروف ہوں تو انہیں اپنے جسم کی طرف توجہ نہیں ہوتی بلکہ ان کی پوری توجہ التفات اپنے خالق کی طرف ہوتا ہے۔ اپنے مقام بندگی کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

"اِلٰهی کَفٰی بِی عِزًا اَنَ اَکُوْنَ لَکَ عَبْدًا وَ کَفٰی بِی فَخْرًا اَنْ تَکُوْنَ لِی رَبًّا اَنْتَ کَمَا اَحَبُّ فَاجْعَلْنِیْ کَمَا تُحِبُّ"

"اے میرے معبود! میرے لیے یہ عزت و اعزاز کافی ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں اور میرے لیے اس سے بڑی فخر کی کوئی بات نہیں کہ تو میرا پروردگار ہے تو ویسا ہی ہے جیسا میں چاہتا ہوں مجھے بھی ویسا بنا دے جیسا تو چاہتا ہے۔

اپنے اس عظیم جملے میں حضرت امیرالمومنینؑ نے اپنے مقام عبدیت اور تمنائے کمالیت کا اظہار فرمایا ہے' عبدیت کی معراج ہی کسی بندے کا کمال ہے اور آپ نے اس کمال پر جس طرح مباہات کا اظہار کیا ہے' وہ یقیناً" مکتب نبوت سے کسب فیض ہی کا نتیجہ ہے۔

علم و معرفت اور حکمت و دانائی ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام میدان شجاعت میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے اور آپ کی بہادری تاریخ اسلام کا عظیم باب ہے۔ حضرت پیغمبر اسلامؐ نے آپ کو اپنی فوج کا سربراہ بنایا اور علم اسلام آپ کو عطاء کیا۔ چنانچہ

آپ نے شجاعت و بہادری کے عظیم کارنامے پیش کرکے اسلام کو فتح و غلبہ سے ہمکنار کیا۔ صدر اسلام کی عظیم جنگوں میں آپ ؑ کے شجاعانہ مظاہرے رہتی دنیا تک یاد رہیں گے۔ آپ کے ثبات و عزم اور عظمت جہاد و ایثار نے فرزندان اسلام کو جذبہ وَ ولولہ عطاء کیا' اسلام کی سب سے پہلی باقاعدہ جنگ یعنی جنگ بدر جو ۲ ھ کو ہوئی۔ اس میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کو لشکر اسلام کی سرداری دی اور اس کے علاوہ جنگ احد ۳ ھ' جنگ خندق (احزاب) ۵ھ' حدیبیہ ۶ھ' خیبر ۶ھ اور حنین ۸ ھ میں حضرت علی ؑ کے شجاعانہ کارناموں سے پرچم اسلام کو سربلندی ملی اور کفرو شرک کو ذلت کے ساتھ شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

کفار و مشرکین نے جب حضرت رسالت ماب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کی سازش کی اور مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا تو حضرت امیرالمومنین ؑ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شانہ بشانہ اپنی توانائیاں اسلام کے تحفظ اور مسلمانوں کو دشمنوں کے شر سے بچانے میں صرف کر دیں۔ جن جنگوں میں آپ ؑ نے مشرکین کو واصل جہنم کیا اور اسلام کے پرچم کو سربلند کرکے لشکر توحید کو فتح و غلبہ دلایا ان میں ہلاک ہونے والے دشمنان اسلام کی اولاد اور نسلوں نے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم' آپ کے اہل بیت ؑ و اصحاب اخیار کے ساتھ دشمنی مول لے لی اور اپنی بھرپور کوششوں کے ساتھ اپنے بزرگوں کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے اسلامی افواج کے سپوتوں کہ جن میں سرفہرست حضرت امیرالمومنین ؑ تھے کو قتل کرنے کی وسیع سازشیں کیں' بالاخر وہ وقت بھی آ پہنچا جب جنگ نہروان میں قتل کئے جانے والے دشمن اسلام "ابو قتام" کے قریبی دوست عبدالرحمان بن ملجم نے حضرت امیرالمومنین ؑ سے بدلہ لیا اور اپنی محبوبہ قتام کے باپ اس کے شوہر اور

بھائی کے قتل کا انتقام لینے کے لیے حضرت علی کے قتل کی سازش میں مرکزی کردار بن گیا' اس واردات میں ابن ملجم کے ساتھ دو افراد نے اس کی معاونت کی جن کے نام یہ ہیں: شبیب بن بحرہ اور وردان بن مجالد'

واقعہ کے مطابق حضرت علیؑ ۱۹ رمضان کی شب اپنی بیٹی جناب ام کلثوم ؑ کے گھر میں تھے' صبح تک عبادت و ذکر خدا میں مصروف رہے' شب ڈھلتے ہی راہی مسجد ہوئے' مسجد میں عبدالرحمان بن ملجم رات بھر طلوع فجر اور امام کی آمد کا منتظر رہا اور امیرالمومنینؑ کے قتل کی منصوبہ بندی کرتا رہا۔ امام علیؑ مسجد میں تشریف لائے' آپؑ نے تحیت مسجد کی نماز ادا کی اور پھر گلدستہ اذان پر جاکر نماز صبح کی اذان دی اور پھر ذکر و نماز و دعا میں مصروف ہو گئے' فارغ ہو کر آپؑ نے مسجد میں سوئے ہوئے افراد کو نماز صبح کے لیے جگانا شروع کیا اور ہر ایک سے یہی کہتے رہے کہ اٹھو' نماز ادا کرو' اس کے ساتھ ساتھ یہ آیت تلاوت فرمائی: "اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ" (نماز ہی تو برائیوں اور غلط کاموں سے روکتی ہے) اسی طرح سب کو فریضہ الٰہی کی ادائیگی کے لیے جگاتے رہے یہاں تک کہ عبدالرحمان ابن ملجم جو کہ تلوار کو چھپائے ہوئے الٹا لیٹا ہوا تھا' اسے بھی جگایا اور فرمایا کہ اس طرح الٹے سونا شیطانی سونا ہے' اٹھو کہ اس طرح جہنمی لوگ سوتے ہیں۔ دائیں کروٹ سوو کہ ارباب حکمت کا سونا ہے یا بائیں کروٹ سوو کہ علماء کا سونا ہے یا پشت پر سوو کہ انبیاء کا سونا ہے' اپنے بیان میں آپؑ نے اس کے جہنمی ہونے کی خبر دے دی۔

سب کو ادائے فریضہ الٰہی کے لیے جگاکر آپؑ مصروف نماز ہو گئے اور ابن ملجم آپؑ کے پاس ستون کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ حضرت علیؑ نے پہلی رکعت

تمام کی اور سجدہ میں گئے' پہلا سجدہ کرکے جب سر اٹھایا تو قاتل نے تلوار کا وار کر دیا۔ جس سے آپؑ مصلائے عبادت پر گر پڑے اور زبان پر یہ الفاظ جاری کئے۔ "بِسْمِ اللّٰہِ وَبِاللّٰہِ وَ عَلٰی مِلَّۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ' فُزْتُ وَ رَبِّ الْکَعْبَہ (مجھے کعبہ کے پروردگار کی قسم میں کامیاب ہو گیا)

ادھر آپؑ کے جسم مبارک سے خون جاری تھا اور محراب و مصلائے عبادت خون سے بھرا ہوا تھا' ادھر امامؑ نصیحت فرما رہے تھے کہ میرے قاتل پر تشدد نہ کرنا' شہر میں کہرام بپا ہو گیا' سب لوگ مسجد میں پہنچنا شروع ہو گئے' امام حسنؑ و امام حسینؑ و دیگر افراد بنی ہاشم آئے' ادھر نماز کا وقت ہو گیا تھا' امام حسنؑ نے نماز پڑھائی اور امیرالمومنینؑ اشاروں سے نماز ادا کرتے رہے تاکہ وقت آخر فریضہ الٰہی ترک نہ ہونے پائے۔ امامؑ اس دوران اپنے اہل بیتؑ' اصحاب اور اہل ایمان کو صبر کی تلقین اور وصیتیں کرتے رہے' زہر آپؑ کے بدن میں پھیل رہا تھا' کوفہ کے اطباء نے بھی چارہ جوئی سے اظہار عجز کر دیا' بالاخر امیرالمومنین اپنی آخری وصیت کر چکے کہ جس میں علوم و معارف' اخلاق و عقائد اور آداب و حقوق زندگی کا جامع بیان ہے' اور پھر شمع امامت گل ہو گئی۔ آفتاب ولایت غروب کر گیا' آہ و بکا سے کوفہ کے در و دیوار لرز اٹھے' ہائے امیرالمومنینؑ شہید ہو گئے' شہر کے باسی یتیم ہو گئے' امت اپنے امیر سے محروم ہو گئی' اسلام کے سب سے پہلے شہید محراب حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے یہ کہتے ہوئے اس دنیا سے آنکھیں بند کرلیں کہ "میں کامیاب ہو گیا ہوں' میں کامیاب ہو گیا ہوں' میں کامیاب ہو گیا ہوں"

شب ۲۱ رمضان ۴۰ ہجری کو آپؑ نے شہادت پائی' آپؑ کا مرقد

مبارک نجف اشرف عراق میں عقیدت مندوں کی زیارت گاہ ہے' سلام ہو آپ ؑ کی روح طیبہ پر!

(بمناسبت شہادت حضرت علی ؑ ۱۹۹۶ء)

حضرت علیؑ: مولود کعبہ، عادل حکمران

فضائل و کمالات کی دنیا میں کچھ نام ایسے ہوتے ہیں جو اپنی امتیازی حیثیت و شخصیت کے حوالے سے انفرادیت کے حامل قرار پاتے ہیں اور ان کا تذکرہ ان کمالات کے لیے ضرب المثل بن جاتا ہے۔ انہی عبقری شخصیتوں میں ایک نام حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا ہے کہ جنہیں خدا نے "مولود کعبہ" ہونے کا منفرد اعزاز بخشا اور حضرت پیغمبر اسلامؐ نے "کل ایمان" ہونے کی سند عطاء فرمائی، تاریخ انسانیت میں آپؑ سے پہلے کوئی خانہ کعبہ میں پیدا ہوا اور نہ ہی آپؑ کے بعد کسی نے یہ شرف پایا، اس خدائی عطیہ کے حوالے سے حضرت علیؑ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

حضرت علیؑ کی ولادت باسعادت کا ذکر کتب تاریخ و حدیث میں تفصیل سے موجود ہے، آپؑ کی والدہ ماجدہ حضرت فاطمہؑ بنت اسد کو نسوانی احساس زچگی ہوا تو آپ نے مسجد الحرام کا رخ کیا اور خانہ کعبہ کا طواف کرنے کے بعد تسہیل ولادت کے لیے بارگاہ الٰہی میں دست دعا بلند کئے، اپنی مخصوص دعا میں حضرت فاطمہ بنت اسد نے خالق کے حضور اپنی عقیدت کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

اے میرے پروردگارا میں تجھ پر ایمان رکھتی ہوں' تیرے بھیجے ہوئے ہر نبی پر ایمان رکھتی ہوں' تیرے مقدس کلام اور اپنے جد ابراہیمؑ کے کلام کی مکمل تصدیق کرتی ہوں کہ اسی نے تیرا یہ پاکیزہ گھر تعمیر کیا' میں تجھ سے تیرے پاک و پاکیزہ نبیوں اور مقرب فرشتوں اور اپنے اس بچے کے حق و فضیلت کا واسطہ دے کر التجا کرتی ہوں جو میرے شکم میں ہے میرا یہ مرحلہ آسان فرما' ابھی آپ کی دعا اختتام کو پہنچی ہی تھی کہ دیوار کعبہ شق ہوئی (بیت اللہ کی جس جانب سے دیوار شگافتہ ہوئی اسے "مستجار" کہا جاتا ہے) اور آپؑ وہاں سے کعبہ کے اندر داخل ہو گئیں' آپؑ جونہی کعبہ کے اندر آئیں' دیوار دوبارہ آپس میں مل گئی اور اپنی پہلی حالت میں آ گئی اور شگاف ختم ہو گیا' پھر آپؑ نے وہاں اپنے فرزند علیؑ کو جنم دیا' (بحار الانوار ج' ۹) یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ جناب فاطمہ بنت اسد کے لیے خانہ خدا کی دیوار کا شگافتہ ہونا ایک غیر معمولی عمل تھا کیونکہ بیت اللہ کا دروازہ موجود تھا کہ جس سے کعبہ کے اندر آنا جانا ممکن تھا لیکن وہ نہیں کھلا بلکہ دیوار شگافتہ ہوئی اور پھر جب آپؑ اندر داخل ہو گئیں تو دیوار دوبارہ بند ہو گئی۔ جس سے ایک غیر معمولی خارق العادت امر کا ثبوت ملتا ہے اور یہ حقیقت کسی اہل نظر و تحقیق سے پوشیدہ نہیں کہ دیوار میں ہونے والے شگاف کا نشان ابھی تک موجود ہے جب کہ گذشتہ صدیوں میں کئی مرتبہ کعبہ کی تجدید عمارت ہوئی اور شگاف کو چاندی سے بھر دیا گیا مگر اس کے باوجود "مستجار" پر ابھی تک وہ نشان واضح طور پر دکھائی دیتا ہے اور اسی جگہ عموماً" حجاج کرام طواف کے دوران رک جاتے ہیں اور دعائیں مانگتے ہیں اور بارگاہ رب العزت میں اپنی حاجات پیش کرتے ہیں۔

تاریخ میں ہے کہ جب حضرت ابو طالبؑ کو اطلاع ہوئی تو آپ کچھ خواتین کو ساتھ لے کر خانہ کعبہ آئے تاکہ سلسلہ ولادت میں خواتین جناب فاطمہؑ کی معاونت کریں' انہوں نے کافی کوشش کی کہ دروازہ کھول دیں تاکہ خواتین اندر داخل ہو سکیں مگر دروازہ نہ کھل سکا یہاں تک کہ وہ سب آگاہ ہو گئے کہ یہ سب کچھ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے' جناب فاطمہ بنت اسد نے بیان کیا کہ میں تھوڑی دیر خانہ خدا کے اندر بیٹھی اور میں نے کسی درد و الم کا احساس کئے بغیر اپنے فرزند علیؑ کو جنم دیا۔

حضرت فاطمہؑ بنت اسد تین دن تک خانہ کعبہ کے اندر رہیں' اس واقعہ کی خبر پورے شہر مکہ میں پھیل گئی اور لوگ جوق در جوق شگافتہ دیوار کے نشان کو دیکھنے کے لیے آتے رہے۔ اس دوران کوئی شخص خانہ کعبہ کے اندر داخل نہ ہو سکا بالاخر تیسرے روز حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چچی جناب فاطمہ بنت اسد اسی جگہ سے باہر آئیں۔ جہاں سے کعبہ کے اندر داخل ہوئی تھیں اور آپ کے ہاتھوں پر نومولود بچہ تھا جس کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا اور اس کی پیشانی سے نکلنے والے نور نے پورے ماحول کو روشن کیا ہوا تھا' اس وقت حضرت فاطمہ بنت اسد نے لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: خدا نے مجھے ایک اعزاز بخشا ہے اور جو بزرگ خواتین خدا کی برگزیدہ ہستیاں مجھ سے پہلے گزری ہیں' مجھے ان پر فضیلت عطاء فرمائی ہے' خدا نے مجھے اپنے مقدس گھر میں کہ جسے دو محترم نبیوں نے تعمیر کیا' داخل ہونے کا امتیازی و منفرد شرف عطاء کیا اور میں نے خانہ خدا کے اندر تین روز تک خدا کی مہمانی و ضیافت میں بسر کئے۔ بہشت سے غذا اور پھل میرے لیے لائے جاتے تھے' یہ مجھ پر خدا کا عظیم احسان ہے اس پر میں

اس کی بارگاہ میں سجدہ شکر ادا کرتی ہوں۔

یہ واقعہ تمام مکاتب فکر کی کتابوں میں مذکور ہے۔ اہل سنت کی معتبر کتب مثلاً" مروج الذہب مسعودی' اثبات الوصیہ' سیرت خلفاء مولانا عبدالوحید دہلوی وغیرہ میں درج ہے' معروف محدث و مؤرخ محمود آسی نے عبدالباقی العمری کے قصیدہ کی شرح میں یہ الفاظ لکھے ہیں' حضرت امیرالمومنین علی کرم اللہ وجہہ کا بیت اللہ کے اندر پیدا ہونا دنیا بھر میں مشہور واقعہ ہے اور فریقین یعنی شیعہ و سنی دونوں کی کتب میں درج ہے اور آپ ؑ سے پہلے اور نہ آپ کے بعد کسی کو بیت اللہ کے اندر پیدا ہونے کا شرف حاصل نہیں ہوا۔

حضرت ابو طالب ؑ نے اپنے فرزند علی ؑ کی ولادت کی خوشی میں تمام اہل مکہ کو دعوت ولیمہ دی جس میں تین سو اونٹ اور ایک ہزار گائے بکریاں ذبح کرائیں اور لوگوں میں اعلان عام کیا کہ سب آکر خانہ کعبہ کا سات مرتبہ طواف کریں اور نومولود کو سلامی دیں کہ خدا نے اسے اپنے گھر میں پیدا کرکے ہمیں اور اسے خاص اعزاز بخشا ہے۔

حضرت علی ؑ کی ولادت عام الفیل سے تیس برس بعد ۱۳ رجب بروز جمعتہ المبارک ہوئی' حضرت علی نے اپنی پوری زندگی خدا کے حقوق کی ادائیگی اور خلق خدا کی ہدایت و رہنمائی میں گزاری' پیغمبر اسلام ؐ نے آپ کو باب مدینۃ العلم کا لقب عطا فرمایا' آپ ؑ نے دعوت اسلامیہ کے ہر مرحلہ میں حضور نبی کریم ﷺ کی معاونت فرمائی' کفار و مشرکین کے مقابلے میں شجاعانہ کارنامے سرانجام دیئے۔ سپاہ اسلام کے سالار اعلیٰ کی حیثیت میں ہر جنگ میں مسلمانوں کی فتح کی علامت رہے' خلیفہ رسول ؐ کی حیثیت میں منصب امامت پر فائز ہو کر معاشرے

کی عادلانہ حکمرانی کا عملی نمونہ پیش کیا' مسند قضاوت پر بیٹھ کر حضرت علیؑ نے جو فیصلے کئے وہ آج تک عدالتی اصولوں کی بنیاد ہیں' امیر و غریب' اپنے و بیگانے' عربی و عجمی اور حاکم و رعایا کے فرق کو یکسر ختم کرکے قرآن و سنت نبویؐ کو معیار عدل قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپؑ کے دور حکومت میں کوئی شخص اپنے حقوق کی بابت عدم تحفظ یا ناانصافی کا احساس ہی دل میں نہ لاتا تھا' آپؑ کے عادلانہ فیصلوں سے معاشرے کا ہر فرد اپنے حقوق کا تحفظ یقینی سمجھتا تھا' آپؑ کے حکیمانہ ارشادات و خطبات کا مجموعہ "نہج البلاغہ" ہے جس میں علوم و معارف الہیہ' توحید و نبوت و معاد اور اخلاقیات کے ساتھ ساتھ معاشرتی سیاسی اصولوں کی بابت نہایت روشن و درخشندہ اصول و ضوابط موجود ہیں۔

حضرت علیؑ نے اپنے دور حکومت میں عدل و انصاف کے قیام کا جو عملی نمونہ پیش کیا' اس سے معاشرے کے ایک عادلانہ نظام حکومت کی اسلامی بنیادیں واضح ہو جاتی ہیں۔ آپؑ نے ایک مرتبہ حکمران کی معاشرتی حیثیت کے بارے میں اس طرح ارشاد فرمایا: کیا میں صرف اسی بات پر خوش اور مطمئن ہو جاؤں کہ لوگ مجھے "امیرالمومنین" کہیں جب کہ میں ان کے مسائل و مشکلات اور امور زندگی میں ان کے ساتھ ساتھ نہ ہوں اور تکالیف میں ان کی دستگیری نہ کروں؟۔ اس بیان میں امام علیؑ نے ایک حکمران کی ذمہ داری کی نشاندہی کی ہے کہ اسے صرف حاکمیت کی مسند پر اکتفاء نہیں کرنی چاہیے بلکہ علمی طور پر عوام کے دکھ درد میں شریک ہو کر ان کی مشکلات کو دور کرنے میں بھرپور کردار ادا کرنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؑ کا طرز زندگی اور انداز حکمرانی بہترین نمونہ عمل ہے کیونکہ اس کی بنیاد قرآن و سیرت نبویؐ کے سوا کچھ نہیں۔ اگر

مدعیان اسلام اس پاکیزہ سیرت کو اپنالیں تو معاشرے میں استحصال و استبداد، ناانصافی و نابرابری اور ظلم و جور کا مکمل طور پر خاتمہ ہو سکتا ہے اور انسانی معاشرہ عدل و انصاف اور امن و سلامتی کی نعمت سے بہرہ ور ہو سکتا ہے۔

انسانی معاشرے کا شورائی نظام

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ

اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے اس میں زندگی کے ہر شعبے سے متعلق رہنما اصول موجود ہیں۔ اسلام میں حاکمیت اعلیٰ صرف خدا کو حاصل ہے۔ وہی سب کچھ کا مالک ہے حقیقی حکمرانی اس سے مخصوص ہے اس کے سوا جو بھی حکومت کا حق رکھتا ہے وہ خدا ہی کا عطا کردہ ہے' انبیاء و مرسلین اور آئمہ معصومین علیہم السلام کی حاکمیت خدائی منصب کے طور پر ہے لہٰذا خداوند عالم نے اس منصب کے عطاء کرنے میں اپنے حاکمانہ' مالکانہ و خالقانہ اختیار کو استعمال کیا ہے۔

افراد بشر کے لیے جو سعادت مند نظام حیات خداوند عالم نے مقرر فرمایا ہے۔ اس کی بنیاد باہمی مشاورت (شوریٰ) پر استوار ہے' باہمی مشاورت کا قانون عقلی و فطری بھی ہے اور قرآنی بھی' اس کی تائید آیات و روایت سے واضح طور پر ملتی ہے' عملی طور پر باہمی مشاورت کا قانون معاشرتی ترقی و استحکام کا باعث ہے کیونکہ اس میں تمام افراد کی فکری و عملی توانائیاں شامل ہوتی ہیں۔ جب کہ اس کے برعکس فردی و شخصی کوششیں خواہ جس قدر مستحکم و وسیع کیوں نہ ہوں مگر

ان کا موازنہ اجتماعی کاوشوں کے ٹھوس آثار سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔

شورائی نظام درحقیقت افراد بشر کی وجودی صلاحیتوں کو یکجا کرکے ان سے صحیح سمت میں استفادہ کرنے کی راہ ہموار کرتا ہے۔ اس وقت دنیا بھر میں جو نظام معاشروں میں رائج ہیں ان کے بارے میں اجمالی تذکرہ کے ساتھ اصل موضوع پر اظہار خیال ہوگا۔

دو قسم کے معاشرتی و حکومتی نظام دنیا میں چل رہے ہیں۔ ا۔ سلطنت و بادشاہت ۲۔ جمہوریت۔ جہاں تک سلطنت و بادشاہت کا تعلق ہے تو اس میں شخصی آمریت اور فردی حکمرانی ہوتی ہے۔ سلطان و بادشاہ ملک کا سپرمین ہوتا ہے اور کسی کو اس سے بالاتر حیثیت حاصل نہیں ہوتی بلکہ آئین کی بالادستی پر اس کی بالادستی ہوتی ہے اور وہ کسی بھی وقت کوئی حکم جاری کرکے اسے ملکی آئین کا حصہ بنا سکتا ہے۔ بادشاہت میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں آتی ہیں۔ بعض ملکوں میں آئینی بادشاہت کو محدود کرکے اس کے ساتھ جمہوریت شامل کر دی گئی ہے۔ تاکہ عوام الناس کو اظہار رائے کا حق بھی مل جائے اور بادشاہ کی حاکمیت کا حق بھی سلامت رہے۔ ایسے نظام میں بادشاہ کا وجود آئین کے پاسدار کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ اب رہی جمہوریت تو اس نظام میں بنیادی حیثیت افراد معاشرہ کی اکثریت کو حاصل ہوتی ہے جس بات پر وہ اتفاق کرلے اسے نافذ العمل قرار دیا جاتا ہے۔ جمہوری نظام میں خواہ صدارتی ہو یا پارلیمانی اصل محور عوام کی آراء ہوتی ہیں۔ صدر یا سربراہ مملکت کو اس میں نظام و آئین کو نافذ کرنے میں ضروری انتظامات کا ذمہ قرا دیا جاتا ہے اور اسے ہی عوامی نیابت و وکالت کے طور پر ضروری اقدامات کرنے کا اختیار حاصل ہوتا

ہے۔ بادشاہت اور جمہوریت میں شخصی رائے اور اکثریتی رائے کے فرق کے علاوہ وقت کی تحدید بھی اہم فرق حاصل ہے۔ اول الذکر نظام میں ""تاحیات" عموماً" ------- اور مئوخرالذکر نظام میں معین مدت تک مسند اقتدار پر فائز رہنا ہوتا ہے۔ ""معین مدت"" کہیں تین، کہیں چار اور کہیں پانچ برس مقرر کی گئی ہے اس سے زیادہ بالعموم جمہوری نظاموں میں نہیں ہوتی اس کے علاوہ بادشاہت میں ""تاحیات"" اس لیے ہوتا ہے کہ اس کا اصل تعین یعنی بادشاہ کی بادشاہت کا اصل نظام چونکہ عوامی آراء سے ماورا ہوتا ہے لہٰذا آئین میں طاقت و اختیارات کا محور سلطان ہی زندگی بھر اپنا سلسلہ اقتدار قائم رکھتا ہے اور اس بالاتر کسی سرچشمہ اختیار کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ تاحیات آئینی سپہ سالار رہتا ہے۔

سلطنت و بادشاہت اور جمہوریت پر مبنی رائج نظاموں کے نہایت مختصر تعارف کے بعد ان پر تبصرہ کرکے معاشرے کے شورائی نظام پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

سلطنت و بادشاہت میں طاقت و اختیاری مرکزیت فرد واحد کے پاس ہوتی ہے اور اسے تمام افراد معاشرہ کے لیے ""حکم"" صادر کرنے کا مکمل اختیار حاصل ہوتا ہے لہٰذا اس کی معاونت کے لیے جمہوری اداروں کی کارکردگی کا دائرہ بھی محدود ہوتا ہے یعنی ایک حد تک پہنچ کر ان جمہوری معاون اداروں کی کار گزاری کا عمل رک جاتا ہے اور پھر بادشاہ کے اختیارات کی نوبت آ جاتی ہے۔ اگرچہ سابقہ ادوار میں قائم سلطنتوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا بلکہ ان میں جمہوری معاون ادارے بھی نہیں بنائے جاتے تھے بلکہ معاون اداروں کو ""مامور"" اداروں کی حیثیت حاصل تھی۔ خود سلطان ہی ان کے تعین اور حدود و اختیارات کی

تقسیم کرتا تھا اور پھر وہی ان کی باز پرس کا حق بھی رکھتا تھا اور اس حق کو بھرپور طاقت کے ساتھ استعمال کرتا تھا لیکن موجودہ ترقی یافتہ دور میں بادشاہت میں یہ ترقی ---- یا تنزلی ----- آئی ہے کہ اس کی حیثیت اعزازی سربراہ کی ہے مگر اس اعزازی سربراہی میں آئینی اختیارات اور آئینی تحفظ بھی حاصل ہے جسے وہ کسی بھی مرحلہ میں استعمال کر سکتا ہے۔

سلطنت و بادشاہت کے جتنے نمونے ماضی کی تاریخ میں پائے جاتے ہیں یا حال میں موجود ہیں ان میں واضح خرابی شخصی آمریت و فردی حکمرانی ہی میں منحصر و محدود نہیں بلکہ اصل خرابی اس شخص کی صلاحیت و اہلیت اور لیاقت کے حوالے سے ہے کیونکہ اب تک تاریخ میں نظام سلطنت کے والی کی جو مثالیں ہمارے سامنے ہیں ان میں کہیں بھی علمی، عملی، فکری، اخلاقی یا دیگر امتیازی خصوصیات ہرگز ملحوظ نہیں یعنی ایسا نہیں کہ اسے مسند بادشاہت پر اس لیے بٹھایا گیا کہ اس میں دوسرے افراد کی نسبت مذکورہ صفات زیادہ پائی جاتی ہیں بلکہ تخت سلطنت پر بیٹھنا اور بادشاہت کا تاج پہننا دیگر عوامل کا نتیجہ ہوتا ہے جن میں طاقت کے زور پر بادشاہ بننے والے زیادہ دکھائی دیتے ہیں چنانچہ کئی ممالک میں عسکری سربراہ سلطنت کا تخت نشین ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے اس اختیار کا حامل ہونے میں طاقت ہی اصل عامل ہوتی ہے اور پھر نظام سلطنت کے تسلسل کی ایک اہم خرابی یہ ہے کہ اس میں موروثیت چلتی ہے۔ پدرم سلطان بود کی بنیاد پر نسل در نسل بادشاہت ان کا "حق" بن جاتا ہے کہ جس میں کسی بھی علمی و اخلاقی یا انسانی معیار فضیلت کا ہرگز لحاظ نہیں ہوتا بلکہ سلطان سے نسبی رشتہ ہی بنیاد قرار پاتا ہے۔

مذکورہ مطالب سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سلطنت و بادشاہت کے نظام میں طاقت کا سرچشمہ واصل محور فرد واحد ہوتا ہے اور پھر اس کی میراث کے طور پر اس کی نسل کسی امتیازی اہلیت کے بغیر مسند اقتدار پر فائز ہو جاتی ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو بادشاہ "تاحیات" ہی نہیں بلکہ "تانسل" حکمران رہتا ہے۔ (یہاں ایک لطیف نکتہ قابل ذکر ہے کہ "تاحیات" کی بجائے "تامرگ" ہونا چاہیے تھا لیکن موت کے لفظ سے ہی خوف آتا ہے اور حیات سے محبت ہے اس لیے تمام تحریروں میں "تاحیات" دکھائی دیتا ہے جس کی تصحیح ضروری ہے۔)

بہرحال ماضی کے تجربات اور حال کے واقعات سلطنت و بادشاہت کے نظام کے وجود و بقاء کی ہرگز تائید نہیں کرتے کیونکہ اس کی ابتداء طاقت کے استعمال سے ہوتی ہے اور دورانیہ آمریت میں گزرتا ہے اور انتہاء ظل اللہ بن کر نسل در نسل اقتدار کی میراث قائم کرنے پر ہوتی ہے اور یہ سب کچھ عقلی، فطری، انسانی، اخلاقی، اجتماعی اور کسی بھی حوالہ سے جائز و درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ نہ ہی اس کی تشکیل معیاروں پر استوار ہے اور نہ ہی اس کی بقاء و تسلسل کسی اصول پر مبنی ہے جس کی وجہ سے اس نظام میں معاشرے کے مسائل و مشکلات کو حل کرنے اور عادلانہ ماحول پیدا کرنے کی کوئی ضمانت نہیں پائی جاتی۔ بادشاہت کی غیر معیاری حیثیت کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں فرد واحد کی حکم فرمائی کی نسبت سے اس کے نزدیک ترین افراد خانہ بھی اس "خود ساختہ اعزاز" میں شریک و حصہ قرار پاتے ہیں جس کی بناء پر ملکہ، شاہزادے اور شاہزادیوں کے مناصب جلیلہ بھی تراشے جاتے ہیں اور ان افراد میں بھی بادشاہ

ہی کی طرح کسی معیار و امتیازی فضیلت و اہلیت کا لحاظ نہیں ہوتا بلکہ ربط و رشتہ ملحوظ ہوتا ہے۔

دوسرے نظام یعنی جمہوریت میں بظاہر طاقت کا سرچشمہ عوام کو قرار دیا جاتا ہے کہ جن کی آراء ہی نظام کی بنیاد ہوتی ہیں اس میں عموماً" اکثریت کو معیار قرار دیا جاتا ہے اور اکثریت نصف سے ایک فرد کی زیادتی پر بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ گویا مجموعی طور ایک رائے کا زیادہ ہونا پورے نظام کی سمت متعین کر دیتا ہے۔ جمہوری نظام میں جہاں طاقت کا سرچشمہ عوامی آراء ہوتی ہیں وہاں ان آراء کو اختیارات کا محور بھی ہونا چاہیے مگر عموماً" ایسا نہیں ہوتا بلکہ عوام کی اکثریت سے مسند اقتدار پر فائز ہونے والے افراد خود اختیارات کے محور بن جاتے ہیں اور اکثریت ایک دوسری شکل میں اقلیت ہی نہیں بلکہ فردیت میں بدل جاتی ہے اور رفتہ رفتہ ارباب آراء کے نظریات بدل جاتے ہیں اور وہ اختیارات کے محور کی تبدیلی کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں جس کی نوبت یہاں تک بھی پہنچ جاتی ہے کہ طاقت کے سرچشمہ اور اختیارات کے محور کے درمیان کشیدگی شدت اختیار کر لیتی ہے اور پورا معاشرہ اس کے منفی اثرات کی زد میں آ جاتا ہے۔

جمہوری نظام میں بنیادی طور پر ایک اہم خرابی وہی ہے جو بادشاہت کے تسلسل کی بابت ذکر کی جا چکی ہے کہ اس میں معیار و امتیازی صفات ملحوظ نہیں ہوتیں۔ اکثریت کی آراء معیار قرار پاتی ہیں اور رائے دہندگان کی فکری، علمی، عملی، اخلاقی، انسانی اور معاشرتی خصوصیات کو ہرگز درخور اعتناء قرار نہیں دیا جاتا اور نہ ہی رائے پانے والوں کے لیے ان طرح کے اوصاف ملحوظ ہوتے

ہین بلکہ ساری توجہ و التفات کمیت پر مرکوز ہوتی ہے کیفیت پر نہیں، اکثریت پر ہوتی ہے، اہلیت پر نہیں، بنا برایں معیاری امتیاز یا امتیازی معیار کے مفقود ہونے کی وجہ سے جمہوریت پنپنے نہیں پاتی اور مسائل و مشکلات کے ختم یا کم ہونے کی بجائے ان میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

شخصی و فردی نظام یعنی بادشاہت و سلطنت کی طرح اجتماعی و اکثریتی نظام یعنی جمہوریت میں بھی بادشاہت جیسے اصول چل نکلتے ہیں کہ جس کا بنیادی سبب کسی معقول و انسانی معیار کا فقدان ہوتا ہے۔

معاشروں میں رائج مذکورہ دو نظاموں کے اجمالی جائزہ سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ ان نظاموں میں پائی جانے والی بنیادی خامیاں ہی افراد کے انسانی و معاشرتی حقوق کی پامالی کا باعث بنتی ہیں جس کے نتیجے میں عدم استحکام، ہرج و مرج، فقر و افلاس، فتنہ و فساد، جرائم و جنایات اور ظلم و جبر و ناانصافی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور پھر معاشرے کی سلامتی و امن خطرے میں ہی نہیں بلکہ یقینی طور پر تباہ ہو جاتے ہیں۔

تیسرا نظام جسے ”شورائی نظام“ کہا جاتا ہے اس میں تین اہم بنیادی امور ملحوظ ہوتے ہیں: ۱۔ ارباب آراء کی صلاحیت ۲۔ رائے پانے والوں کی اہلیت ۳۔ نظام کی بقاء و استمرار میں دونوں کی مکمل، ہمہ گیر اور معیاری عملداری۔

اسلام کے حیات بخش نظام میں اسی شورائی نظام کو معاشرے کی بقاء و سلامتی اور استحکام و سعادت مندی کا ضامن قرار دیا گیا ہے۔ عقل بھی اسی کی تائید کرتی ہے کیونکہ اس میں تمام افراد معاشرہ شریک کار ہوتے ہیں اور ان کی انفرادی صلاحیتیں اجتماعی شکل میں سامنے آتی ہیں۔ باہمی مشاورت پر مبنی اس

نظام میں ارباب آراء کی فکری، علمی و عملی اور اخلاقی و انسانی حیثیت ملحوظ ہوتی ہے۔ کمیت و مقدار کی بجائے کیفیت و معیار ملحوظ ہوتا ہے لہٰذا اس کی ہمہ گیری اپنی اثر گزاری سے معاشرے کی مشکلات و مسائل کے حل کی ضامن بن جاتی ہے۔ عصر حاضر کی قانون ساز قوتوں نے بھی اسے ہر لحاظ سے قابل عمل قرار دیا ہے۔ اس میں بادشاہت و سلطنت کی طرح کسی فرد کو اختیارات کا محور قرار نہیں دیا جاتا اور نہ ہی آراء کی کثرت کو نصف سے ایک فرد کے بھی زائد ہونے کی وجہ سے کافی سمجھا جاتا ہے بلکہ اصل ہدف کے حصول میں مطلوب جہات ہی مدنظر ہوتی ہیں۔

شورائی نظام میں سلطانی جمہور کا حقیقی تصور موجود ہے اور اس کے بنیادی عناصر افرادی قوت کے معیاری اصول سے مرکب ہیں اس لیے آمریت و استبداد کی راہیں خود بخود مسدود ہو جاتی ہیں اور لائق و شائستہ افراد کی فکری قوتوں کے تقارن سے باہمی تعاون کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں حاکم اور رعایا کے درمیان قدرت و غلبہ اور برتری و بالادستی کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں کیونکہ تمام افراد ایک ہی مقصد و ہدف تک پہنچنے کے خواہاں و درپے ہوتے ہیں۔

شورائی نظام میں اہم ترین عمل آزادی اظہار رائے کا ہوتا ہے کسی پر اپنی رائے کی تشکیل و اظہار میں کسی طرح کی محدودیت و پابندی یا متعین خطوط پر چلنے کا التزام نہیں ہوتا بلکہ ہر شخص اپنی فکری توانائیوں کے ساتھ اظہار رائے کرتا ہے خواہ اس کی رائے دوسری آراء سے متفق ہو یا مختلف، اس کی رائے کا وزن و اعتبار دوسرے ہر فرد کی رائے کے وزن و اعتبار کی طرح ہوتا ہے کیونکہ

رائے دہندگان کے معیار میں یکسانیت پائی جاتی ہے اور ان کا معیاری حصہ ہی ان کے حقوق کا ضامن ہوتا ہے۔

شورائی نظام میں کسی فرد کی حکمرانی کی بجائے اجتماعی طور پر تمام مربوط افراد کی مشترکہ آراء پر مبنی فیصلہ ہی نافذ العمل سمجھا جاتا ہے اور اس فیصلہ میں حالات کے مطابق تبدیلی کا اختیار ہر وقت باقی رہتا ہے کیونکہ کسی فیصلہ کو تاابد قابل عمل قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ حالات کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلی کا عمل بنیادی اصولوں پر مبنی کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔

شورائی نظام میں رائے دہندگان کی حیثیت مؤکل اور رائے پانے والوں کا مقام وکیل جیسا ہوتا ہے۔ رائے پانے والا رائے دہندگان کی نیابت و ترجمانی کرتا ہے اس لیے اس کے اختیارات کی مدت و دائرہ کار کا تعین مستقل بنیادوں پر نہیں ہو سکتا بلکہ حسب ضرورت اور بمطابق حالات ان میں تبدیلی کا عمل تسلسل سے جاری رہتا ہے۔

شورائی نظام میں کسی بھی فرد کو خواہ اس کا تعلق رائے دہندگان سے ہو یا رائے پانے والوں سے ہو' اپنی حیثیت و عنوان کو موروثی بنانے کا حق حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ اس سے معیار کی بالادستی یا اعتبار کی نفی ہوتی ہے عملی طور پر ہر فرد اپنی مخصوص خصوصیات و اوصاف اور صلاحیت و اہلیت کی بنیاد پر پہچانا جاتا ہے لہٰذا اس کے فردی امتیازات کو موروثی قرار دینا بے معنی ہے۔

شورائی نظام میں افراد کی انفرادی مصلحتوں کی پاسداری کو اجتماعی مصالح کے تحفظ و معاشرتی مفادات سے مربوط قرار دیا جاتا ہے اس لیے معاشرتی وسائل کا استعمال عمومی مصلحتوں کے ضوابط سے وابستہ ہوتا ہے تاکہ کسی فرد کے

مخصوص و محدود مفادات دوسرے افراد معاشرہ کے حقوق کے ضیاع کا سبب نہ بن سکیں بلکہ ہر فرد کو اس کے فطری حقوق و مصالح سے بہرہ ور ہونے کا برابر موقع میسر آئے۔

شورائی نظام میں آئین سے بالاتر کسی قوت کا تصور و گنجائش موجود نہیں تمام افراد معاشرہ کہ جس میں رائے دہندگان و رائے پانے والے بھی شامل ہیں' آئین کی بالادستی کے سایہ میں اپنے حقوق پا سکتے ہیں۔

شورائی نظام چونکہ صلاحیتوں اور معیاروں پر مبنی ہوتا ہے اس لیے اس میں استحصال و استعمار کی گنجائش ہی نہیں ہوتی جس کی وجہ سے کوئی فرد اپنے اختیارات کی حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا۔

شورائی نظام ہی اصل جمہوری نظام ہے لیکن لفظی طور پر اسے جمہوری نظام اس لیے نہیں کہا جاتا کہ جمہوریت میں عوام اور شورائی نظام میں عوام میں ان خواص کا عمل دخل ہوتا ہے جو اپنے امتیازی اوصاف' فکری و عملی قوتوں و صلاحیتوں کے سبب معاشرتی حقوق کے تحفظ کی اہلیت رکھتے ہیں۔

موجودہ دور میں کئی ایسے جمہوری نظام دکھائی دیتے ہیں جن میں شورائی نظام کو معاون اداروں کی حیثیت دی گئی ہے بنیادی مقام نہیں جب کہ حقیقت امر اس کے بالکل برعکس ہے' شورائی نظام کی حکم فرمائی اصل ہے اور جمہوری اصولوں کی حیثیت اس کی فرع اور اس کے معاون کی ہے خواص الناس کو عوام الناس کے حقوق کا تحفظ کرنے کی ذمہ داری نبھانے کے لیے اپنی فکری توانائیوں کے ساتھ جمہور عوام کی عملی معاونت سے امور حل کرنے ہیں۔

شورائی نظام کی بابت مذکورہ مطالب سے اس کی اہمیت' افادیت اور

حیثیت سے اجمالی آگاہی حاصل ہو سکتی ہے اس کی تائید و بنیادی ترکیب قرآن مجید کی ایک آیت کا مطالعہ کرنے سے واضح ہو جاتی ہے۔ (یہ امر ملحوظ رہے کہ اسلام نے شورائی نظام کا جو تصور دیا ہے اس کا تعلق اعتقادی مسائل سے نہیں بلکہ معاشرتی زندگی کے امور سے ہے)

"فَمَا اُوْتِیْتُمْ مِنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَمَا عِنْدَاللّٰہِ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ۔ وَالَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبَائِرَ الاثمْ وَالْفَوَاحِشَ وَ اِذَا مَا غَضِبُوْا ھُمْ یَغْفِرُوْنَ۔ وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّھِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ امْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ وَ مِمَّارَزَقْنَاھُمْ یُنْفِقُوْنَ۔ (سورئہ شوریٰ ۳۶۔۳۸)

(پس جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے وہ دنیاوی زندگی کا ساز و سامان ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے ان لوگوں کے لیے جو صاحبان ایمان ہیں اور اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں' وہ لوگ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرتے ہیں اور برائیوں سے دور رہتے ہیں اور جب غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں' وہ اپنے پروردگار کا حکم مانتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور ان کے سب کام آپس کے مشورے سے ہوتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں رزق دیا ہے' وہ اس سے راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں

یہ آیات قرآن مجید کے سورۂ شوریٰ میں ہیں۔ شورائی نظام کی اہمیت کس قدر زیادہ ہے کہ خداوند عالم نے اپنی مقدس کتاب میں ایک مستقل سورت اسی نام (شوریٰ) سے موسوم کیا ہے' اس سورت کی ابتدائی آیات سے ہی شورائی نظام کے بنیادی عناصر و ارکان کا تذکرہ شروع ہو جاتا ہے اور خداوند عالم کی

حاکمیت مطلقہ سے لے کر معاشرتی مسائل و مشکلات کے حل تک کے ضروری قوانین و احکام کے بیان کے بعد وسطی آیات میں شوریٰ کا ذکر ہے۔

قرآن مجید نے جس شورائی نظام کا تعارف کرایا ہے اس میں ارباب آراء کی یہ صفات ذکر کی ہیں:

☆ صاحبان ایمان ہیں۔

☆ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

☆ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرتے ہیں۔

☆ برائیوں سے دوری اختیار کرتے ہیں۔

☆ غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔

☆ اپنے پروردگار کا حکم مانتے ہیں۔

☆ نماز قائم کرتے ہیں۔

☆ ہر کام باہمی مشاورت سے کرتے ہیں۔

☆ ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

ان صفات کے حامل افراد کی اجتماعی قوتوں کے یکجا ہونے سے معاشرتی امور و مسائل عادلانہ طور پر حل ہو سکتے ہیں۔

سب سے پہلی صفت یہ ہے کہ وہ صاحب ایمان ہیں' اس سے خودساختہ خداؤں کی حاکمیت کی نفی ہوتی ہے اور یہی بنیادی حقیقت ہے جس پر پورے نظام کی بنیاد قائم ہے' اس سے دیگر تمام صفات جنم لیتی ہیں اور انسان کی قوت ارادہ کے استعمال کی راہیں متعین ہوتی ہیں۔

دوسری صفت میں خدا پر بھروسہ کرنے سے فکری و عملی استقلال حاصل ہوتا ہے جو کہ معاشرتی نظام میں غیر معمولی اہمیت کا حامل مسئلہ ہے اس کے بغیر نظام کی بقاء کی ضمانت نہیں ملتی۔

تیسری صفت اخلاقی پختگی کی بنیادیں فراہم کرتی ہے جس سے افراد معاشرہ ہر طرح کی استحصالی فکر و استعماری عمل سے محفوظ ہو جاتے ہیں جو کہ پورے نظام کا اہم مسئلہ ہے۔

چوتھی صفت انسانی حقوق کی پاسداری کو یقینی بناتی ہے اور جرائم و جنایات کی بیخ کنی کرتی ہے۔

پانچویں صفت بلند پایہ اخلاق کی ضامن ہے اور معاشرے میں انسان کو باعزت مقام عطاء کرتی ہے۔

چھٹی صفت آئین کی بالادستی اور حاکم مطلق (خدا) کی مکمل اطاعت کی ضرورت کو ثابت کرتی ہے اور یہ امر نظام کی بقاء کا ضامن ہے کیونکہ اس کے بغیر طبقاتی امتیاز پیدا ہو سکتا ہے جس سے معاشرے کی بنیاد متزلزل ہوگی۔

ساتویں صفت قانون کا عملی ثبوت فراہم کرنے کی راہ دکھاتی ہے کہ صرف آئین کی بالادستی کا اقرار ہی کافی نہیں بلکہ اس کے ہر پہلو کو عملی جامہ پہنانا ضروری ہے۔

آٹھویں صفت نظام کی اصل و اساس کو واضح کرتی ہے کہ مذکورہ صفات کے حامل افراد کا معاشرتی نظام باہمی مشاورت پر مبنی ہے اور وہ اپنا ہر کام ایک دوسرے کی فکری توانائیوں سے استفادہ کرتے ہوئے انجام دیتے ہیں۔

نویں صفت دولت و ثروت اور اقتصادی نظام کی اہم بنیادیں فراہم

کرتی ہے۔ مالی فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ خدمت خلق اور ایثار و سخاوت کے جذبات کو جنم دیتی ہے اور معاشی حوالہ سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کا احساس زندہ کرتی ہے۔

شورائی نظام میں رائے دہندگان اور رائے پانے والوں کی مذکورہ صفات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام نے جس نظام کا تعارف کرایا ہے اس میں معاشرے کے لیے کس قدر سعادت و استحکام کی ضمانت موجود ہے' اور یہی وہ اہم ترین بنیاد ہے جس سے نظام کے خدوخال واضح ہوتے ہیں۔ شخصی آمریت کی راہیں مسدود ہوتی ہیں اور افراد کی کثرت کے غلط میعار کے برے آثار سے نجات ملتی ہے۔ تمام افراد معاشرہ کے حقوق کو تحفظ حاصل ہوتا ہے' استحصال و استعمار کا سدباب ہوتا ہے اور انسانی حقوق کی پاسداری یقینی ہو جاتی ہے۔ معاشی استحکام پیدا ہوتا ہے اور اخلاقی اقدار اجاگر ہوتی ہیں' ہر فرد کو اپنے حقوق و حدود سے آگاہی حاصل ہوتی ہے اور ان کے حصول و تعین کا پتہ چلتا ہے۔

شورائی نظام کی مذکورہ اجمالی وضاحت کے ساتھ دیگر نظاموں سے اس کا تقابلی جائزہ اس امر سے آگاہی دلا سکتا ہے کہ انسانی معاشرے میں اس مقدس و سعادت بخش نظام کی اہمیت کیا ہے اور اس وقت دنیا بھر میں اس کے علاوہ دیگر نظاموں نے جو صورت حال پیدا کر دی ہے اس سے نجات کا راستہ اور واحد حل اسی شورائی نظام کا مکمل قیام و نفاذ ہے کہ جسے عقل و فطرت سلیمہ اور قران ----- آئین خداوندی ------- کی تائید حاصل ہے۔

دسمبر ۱۹۹۹ء

دنیا میں کب امن قائم ہو گا؟

ہر دور میں انسان کی یہی آرزو رہی ہے اور وہ اس کے لیے کوشاں بھی رہتا ہے کہ اس کی زندگی میں اس کے ملک میں اور دنیا بھر میں امن قائم ہو۔ اس مقصد کے لیے انفرادی ہی نہیں اجتماعی طور پر بھی کوششیں ہوتی رہتی ہیں' حکومتیں بھی اپنی مشینری استعمال کرتی ہیں اور عالمی سطح پر بین الاقوامی تنظیمیں بھی اس سلسلے میں اپنی خدمات پیش کرتی رہتی ہیں مگر نہ تو ابھی تک امن قائم ہوسکا ہے اور نہ ہی اس سلسلے میں کوئی قابل ذکر پیش رفت ہوئی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید زیادہ مناسب ہوگا کہ اس کے برعکس بدامنی کی صورت پیدا ہوئی ہے اور دنیا بھر میں افراتفری اور انتشار' جنگ و جدال اور انسانی حقوق کی کھلم کھلا پامالی کے مظاہر دیکھنے میں آئے ہیں۔ اس وقت ساری دنیا مہلک ہتھیاروں کی زد میں ہے' پل بھر میں بٹن دباتے ہی بساط زمین الٹی جا سکتی ہے۔

امن قائم کرنے کی کوششوں میں مصروف عالمی ادارے انہی ممالک کے نمائندوں پر مشتمل ہیں بلکہ وہی اس کا نظام چلاتے ہیں جو خود امن تباہ کرنے والے ہتھیاروں کے خالق ہیں۔ معلوم نہیں اس صورت حال میں قیام امن کی کوششیں کیا اور کیونکر نتیجہ خیز ثابت ہوں گی۔ جس طرح آج کمپیوٹر اور سائنسی

ترقی نے دنیا کو حیران کیا ہوا ہے اور اس میں ہر روز نئی ایجادات و تحقیقات سامنے آ رہی ہیں تو کیا ہی اچھا تھا کہ امن کے قیام کی بابت ان توانائیوں کو بروئے کار لایا جاتا اور قیام امن کے راستے میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے اقدامات کئے جاتے ہیں لیکن اس کے برعکس تعلیمی ترقی اور تحقیقی ارتقاء جدید ترین اسلحہ اور ایٹم بم کی صلاحیت حاصل کرنے میں منحصر سمجھا جاتا ہے اور عصر حاضر اس سلسلے میں تمام سابقہ ادوار سے آگے بڑھ چکا ہے جب کہ گذشتہ ادوار کو جاہلیت یا جہالت کا تاریک زمانہ کہا جاتا ہے اور موجودہ زمانہ کو ترقی و علم کی روشنی کا دور کہا جاتا ہے مگر عملی طور پر صورت حال اس کے برعکس ہے کیونکہ وہ ترقی کیا ترقی ہے جس میں انسان کشی کے وسائل کی تیاری کو مایہ افتخار و وجہ امتیاز سمجھا جائے اور دوسروں پر برتری حاصل کرنے کا نام سپرپاور ہونا رکھ دیا جائے۔

حقیقت میں انسان اپنے مادی وسائل سے استفادہ کرنے میں انسانی و عقلی معیاروں کو فراموش کر چکا ہے اور اخلاقی و فطری قدروں کی عملی پاسداری سے منہ موڑ چکا ہے ورنہ اسے بھی معلوم ہے کہ مہلک ایٹمی ہتھیاروں سے انسانیت کی خدمت نہیں بلکہ خیانت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج وہ ممالک جو اسلحہ سازی میں مہارت کی وجہ سے اپنے آپ کو "طاقتور" کہلاتے ہیں ان کی اخلاقی پستیاں تاریخ کی ناقابل انکار حقیقت ہے۔ وہ خود بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس مادی ترقی سے انسان کشی میں اضافہ ہوا ہے اور اس کی روک تھام کے لیے عالمی سطح پر کانفرنسیں' اجتماعات وغیرہ بھی منعقد کرتے ہیں مگر عملی طور پر ان اجتماعات کی نفی کرتے ہوئے روز بروز نئی ایجادات میں سرگرم عمل ہیں۔ کوئی ہے جو ان "طاقت وروں" سے پوچھے کہ جب یہ سب کچھ انسان کشی کا

سبب ہے تو اس میں مزید وسعت دینے کا مقصد کیا ہے؟۔ ہمیشہ قوموں کی تباہی ان کے فعل و قول میں تضاد کے سبب ہوئی ہے۔ تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ قول و فعل میں عدم مطابقت کی وجہ سے کتنی اقوام لقمہ اجل ہی نہیں بلکہ نشان عبرت بن گئیں۔ اس وقت مشرق و مغرب میں پھیلے ہوئے انسانی حقوق کے علمبرداروں نے ماضی میں ہونے والے انسانیت کش اعمال کی روک تھام کے لیے مادی و افرادی قوت کے استعمال سے اپنے اہداف حاصل کرنے کا تبلیغی سلسلہ اتنا وسیع کیا ہوا ہے کہ دنیا میں مظلوم و محروم اقوام کو قیام امن کے سنہرے خواب ہی شاید کچھ دیر کے لیے سکون کا سانس لینے دیتے ہیں۔ اخبارات و دیگر ذرائع ابلاغ پر پروپیگنڈہ مہم اس حد تک زوروں پر ہے کہ کسی کو ان اداروں اور ان کی انسانیت نوازی پر شک ہی نہیں ہو سکتا۔ اربوں ڈالروں کے ماہانہ اخراجات سے یہی اندازہ بلکہ یقین ہونے لگتا ہے کہ قیام امن کی یہ سب کوششیں سنجیدگی پر مبنی ہیں اور اب دنیا میں امن قائم ہونے ہی والا ہے کہ جب سارے افراد بشر ایک ہی خاندان کی طرح سلامتی و سکون کے ساتھ زندگی بسر کریں گے۔ علم کی روشنی پھیلے گی، عمل کی دنیا آباد ہوگی اور کوئی کسی پر ظلم نہ کر سکے گا، کسی کی حق تلفی نہ ہوگی اور دنیا امن کا گہوارہ بن جائے گی۔ اس آرزو و تمنا ہی نے انسان کو فکری زندگی دی ہوئی ہے۔

عصر حاضر کی سائنسی ترقی نے دور دراز کے تمام مکانی و زمینی فاصلوں کو ختم کر کے افراد بشر کے درمیان رابطوں کی دنیا جس طرح آباد کر دی ہے کہ اب مشرق و مغرب کے فاصلے تصور کی حد تک باقی ہیں۔ ایک خطہ کے باسی دوسرے خطہ میں رہنے والوں سے معاملات و معاشرتی روابط میں اس قدر مصروف ہیں کہ

گویا وہ ہر روز اور ہر لمحہ ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہین تو کیا ایسا ممکن نہیں کہ ان افراد انسان کے درمیان امن و سلامتی کو یقینی بنایا جائے اور ایک دوسرے کے فکری وسائل کو قیام امن کے لیے اسی طرح استعمال میں لایا جائے جس طرح مالی وسائل سے استفادہ کیا جاتا ہے؟۔ یہ تمام قوتیں جو انسان کو حاصل ہیں ان کے مثبت جہات میں استعمال سے پوری دنیائے انسانیت امن و خوش حالی کی نعمت سے مالا مال ہو سکتی ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ انسان خود اس حقیقت کو خاطر میں نہیں لاتا کہ اس کی خوشیاں اور امن و خوشحالی مادی ترقی میں منحصر نہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اب تک دنیا میں امن ہی امن قائم ہوتا مگر ایسی بات نہیں کیونکہ مادی ترقی مادی سکون تو فراہم کر سکتی ہے روحانی نہیں۔ امن و سلامتی کے لیے ضروری ہے کہ مادی وسائل کو اس طرح استعمال کیا جائے کہ روحانی و حقیقی امن و سکون حاصل ہوسکے مادی سکون خود مادہ کی طرح عارضی ہے اسے دوام حاصل نہیں جبکہ روحانی قدروں کی پاسداری ہی امن و سلامتی کی ضامن ہے اس لیے اگر سائنسی ترقی و پیشرفت کو مادی و روحانی ترقی کا ذریعہ نہ بنایا گیا تو صرف مادی ترقی امن کی بجائے انتشار اور سلامتی کی بجائے جنگ کی آگ روشن کرے گی جیسا کہ عصر حاضر میں ہو رہا ہے اور ہم اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ کسی خطہ میں امن نہیں خواہ وہ ممالک ہی کیوں نہ ہوں جو اپنے آپ کو "طاقتور" کہلاتے ہیں بلکہ ان ممالک میں بدامنی دوسرے ممالک کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ اخلاقی جرائم کی تعداد خوفناک حد تک ہے اور اندرونی طور پر ان کا عدم استحکام کسی سے پوشیدہ نہیں تو اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہوں نے اپنی تمام تر توانائیاں دوسروں پر مادی برتری حاصل کرکے "طاقتور" کہلانے

میں صرف کر دی ہیں اور اب تک صرف کر رہے ہیں۔ دوسروں کی ثروت و دولت کو اپنے زیر اثر کرنے میں منہمک ہیں کہ جس کے نتیجے میں قیام امن کی بجائے انتشار و افراتفری کی فضاء قائم ہو چکی ہے اور اگر یہی صورت حال باقی رہی تو دنیا تباہی کا شکار ہو جائے گی اور کہیں بھی امن کے قیام کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

قیام امن اور عالمی سطح پر سکون و سلامتی کے لیے، دونوں وسائل بروئے کار لانے کی ضرورت ہے۔ مادی اور روحانی، فکری و عملی، اس وقت علم نے جس طرح اپنی پیشرفت سے انسان کی مادی مشکلات پر قابو پانے کی راہیں کھول دی ہیں اسی طرح اس سے روحانی و فکری اور عملی سکون و امن اور سلامتی کے حصول کو بھی یقینی بنایا جاسکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے پختہ ارادے اور عزم بالجزم کی ضرورت ہے۔ تمام ممالک اپنی افرادی قوتوں کو یکجا کر کے قیام امن کی کوششوں کو کامیاب بنانے کے لیے اپنا کردار ادا کریں تو نہ احساس برتری پیدا ہو گا اور نہ ہی نسل، زبان اور علاقہ کی بنیاد پر جنگیں ہوں گی بلکہ مادی وسائل اور دنیا کی نعمتوں سے ابدی زندگی کے حصول کی ضمانت مل جائے گی اس لیے محسن انسانیت پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "الدنیا مزرع الاخرۃ" دنیا آخرت کی کھیتی ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ اس کے وسائل استعمال کر کے ابدی حیات کو یقینی بنایا جا سکتا ہے اور امن قائم کر کے انسانیت کو تباہی سے بچایا جا سکتا ہے۔ عالمی سطح پر قیام امن کے لیے انسانی و مادی وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے اس سوال کا جواب جلد فراہم کیا جا سکتا ہے کہ "دنیا میں امن کب قائم ہو گا؟۔"

فروری ۱۹۹۸ء

Acc No.....Date.....

Section.....Status.....

D.D. Class .....

NAJAFI BOOK LIBRARY

ہماری دیگر کتب

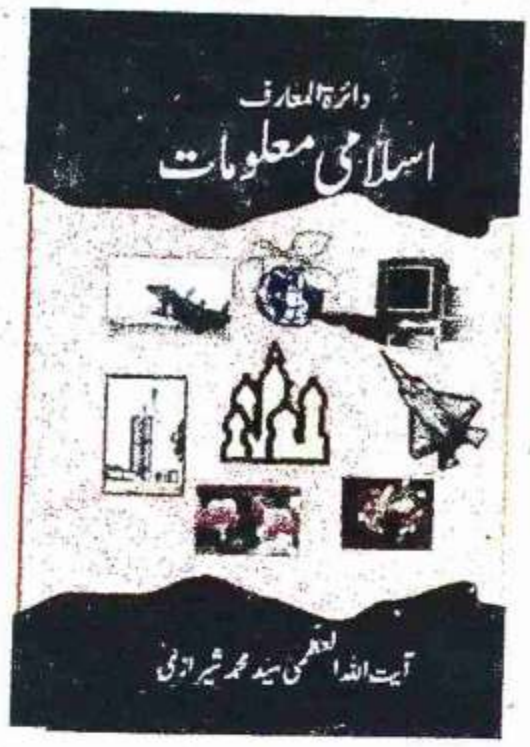

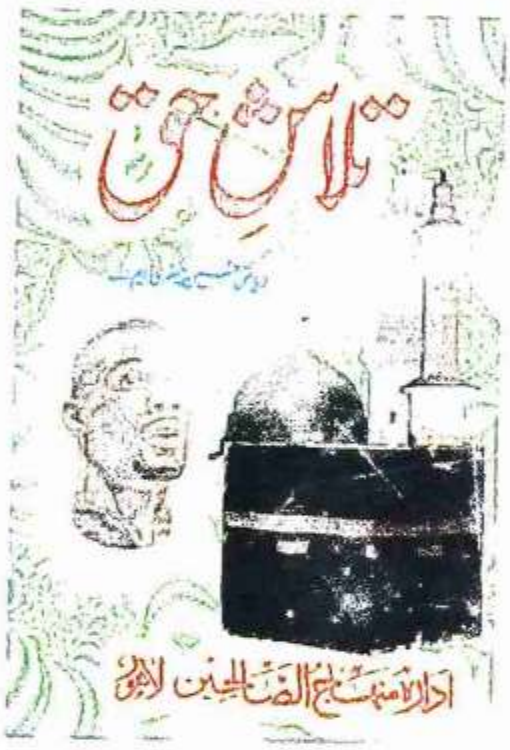

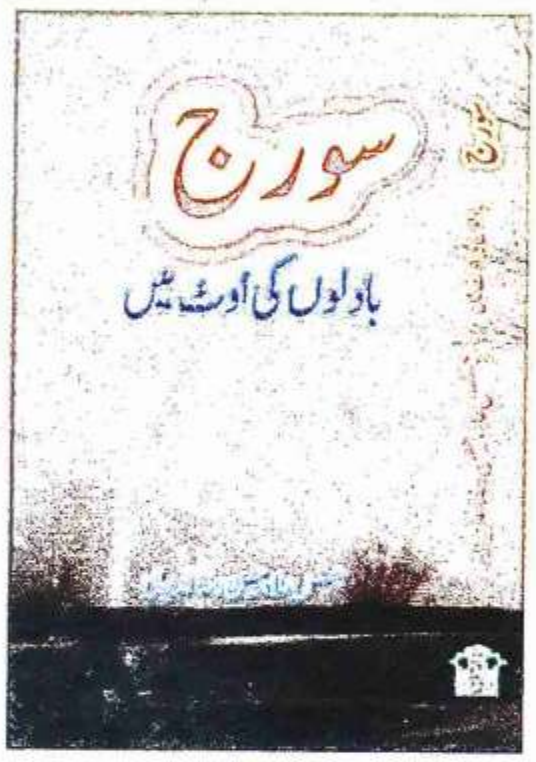

ادارہ منہاج الصالحین لاہور